KitaabPoint.blogspot.com

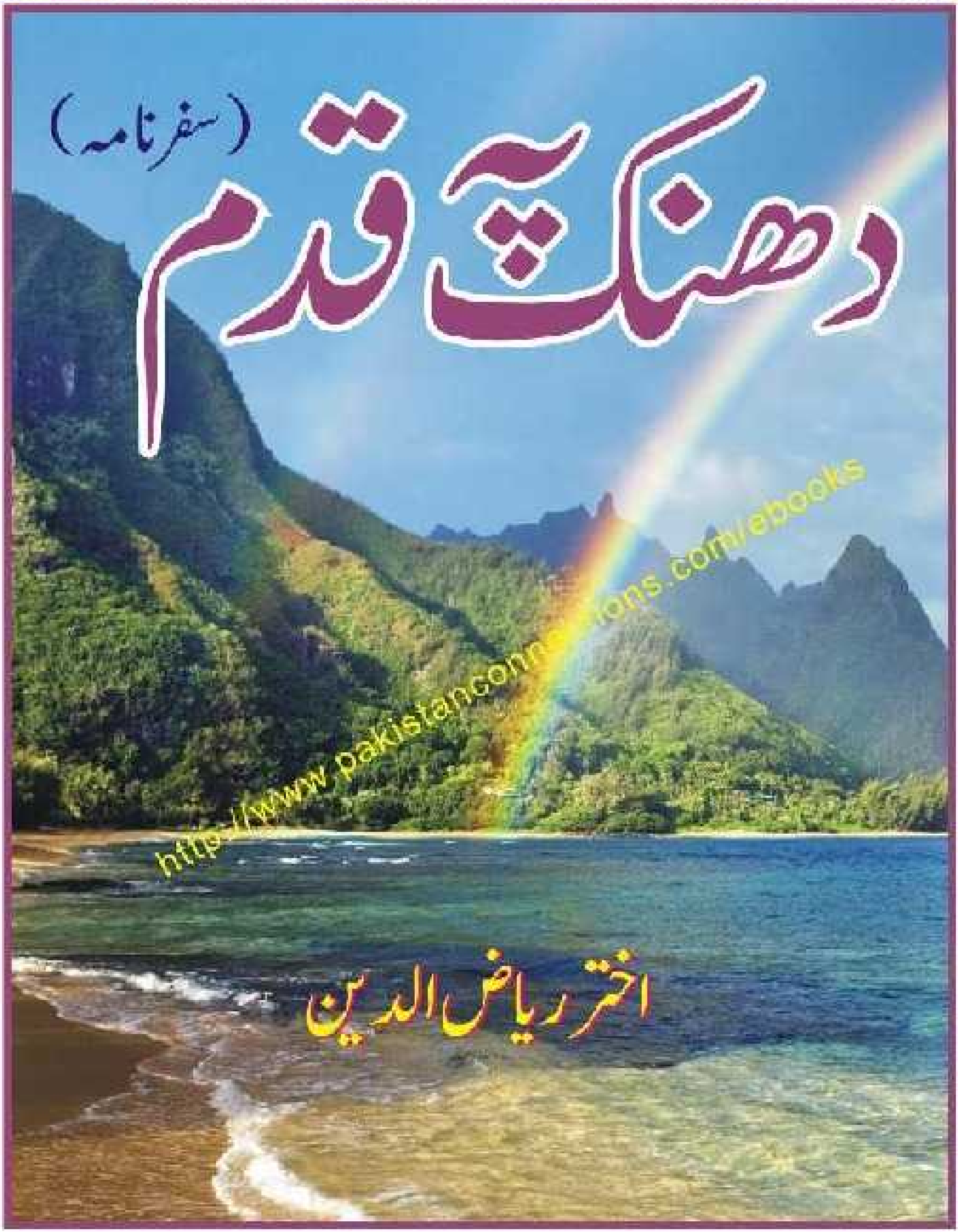

KitaabPoint.blogspot.com

دھنک پہ قدم

(سفرنامہ)

اختر ریاض الدین

KitaabPoint.blogspot.com

اختر ریاض الدین

اعتذار

میری پہلوٹھی کی کتاب ''سات سمندر پار'' کی پیدائش پر قومی پریس نے جس طرح اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور جس طرح تنقیدی تبصروں میں اس کا ذکر آیا اس سے میں بہت گھبرائی کہ کہیں اہل ادب مجھے سنجیدہ طور پر اپنے زمرے میں شامل نہ کرلیں۔ جگہ جگہ سے دعوت نامے آنے شروع ہوگئے کئی رسالوی نمائندوں نے انٹرویو کے لیے وقت مانگا۔ میں نے سر کھجایا کہ یا رب! میری لاج رکھ لیجو۔ تیرہ سال انگریزی پڑھاتی رہی اور آٹھ سال سے پاکستان ٹائمز کے لیے لکھ رہی ہوں اردو ادب کا ساتھ کبھی کا چھوٹ چکا جب مجھ سے سوال ہوگا کہ اردو میں آپ کا محبوب ناول نگار کون ہے؟ تو میں کیا جواب دوں گی۔ شکر ہے جہاں بھی گفتگو ہوئی صرف ذاتی سفر اور تجربوں پر ہی ہوئی۔

حیدرآباد کے ایک وکیل صاحب نے بہت پرخلوص خط میں یہ بھی تجویز پیش کی ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہونا چاہیے اور اس کے لیے وہ اپنی خدمات پیش کر رہے تھے۔ میں چاہتی تو انگریزی میں شاید کچھ لکھ ہی لیتی لیکن مولانا صلاح الدین کے اصرار پر میں نے اردو میں قلم اٹھایا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو ادب میں سفرناموں کی بہت کمی ہے اور خاص طور پر موسکو پر جب ریسرچ کی تو پتہ چلا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اردو میں چند اوراق ۱۹۲۸ء میں لکھے تھے' جو وقت کے ہاتھوں پبلک لائبریری میں پیلے پڑ چکے ہیں۔

ویسے تو میں نے اردو اور فارسی بی اے تک لی تھی مگر پھر بھی انگریزی اس طرح چڑ گئی تھی کہ مکمل جملہ اپنی مادری زبان میں نہیں اترتا تھا۔ میرے والد جو ہر فن گھول کے پی چکے تھے' اردو کے غیر معروف شاعر بھی ہیں' وہ اکثر میری کھچڑی اردو پر صلواتیں سنایا کرتے تھے۔

جب ان کو میری پہلی کتاب کے بارے میں معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے بلوا بھیجا اور کہا۔ ''صاحبزادی! اس ملک میں اردو چین سے اپنی موت آپ مر رہی ہے۔ تم تو اس کے آخری وقت میں اس کی مٹی پلید نہ کرو۔'' اس طنز کے نتیجہ میں دوسری کتاب حاضر ہے۔ ضد میں انسان کیا کیا حرکتیں نہیں کر بیٹھتا۔

KitaabPoint.blogspot.com

بہرحال میری اس ادبی یتیمی کی حالت میں مولانا صلاح الدین کے بعد اگر کسی نے سر پر ہاتھ رکھا تو طفیل صاحب نے بڑے صبر وتحمل کے ساتھ انہوں نے میری جناتی لکھائی کو پڑھا اور اصلاح دی۔ میری املا ہمیشہ سے مشکوک رہی ہے۔ خدا کسی دشمن کو بھی ا۔ع۔ز۔ذ۔ض کے چکر میں نہ ڈالے۔

ویسے اب سفرناموں سے دل بھر گیا ہے۔ سفرنامہ اردو میں لکھنے سے محنت دوگنی کرنا پڑتی ہے۔ بیشتر انگریزی نام اگر صرف اردو میں لکھے جائیں تو سمجھ میں نہیں آتے' اگر بریکٹ میں انگریزی لکھتے جاؤ تو صفحہ اینگلوانڈین لگنے لگتے ہیں۔

ہمارے ایک دوست نے جو اتفاق سے سی ایس پی ہیں ''دھنک پر قدم'' کا مسودہ پڑھ کر مجھ پر دو الزام لگائے۔

الزام نمبر ا: کہ میں میں نے اپنے میاں کو اس کتاب کا ہیرو بنا دیا ہے۔

الزام نمبر ۲: کہ میں نے ساری ''سی ایس پی'' برادری کا مضحکہ اڑا کر اس کی وہ متبرک ناک نیچی کردی جو پبلک میں ہمیشہ اونچی رہتی ہے۔

جواب نمبر ا: میں اپنے میاں کو چھیڑے بغیر رہ نہیں سکتی۔ یہ میرا موروثی حق ہے۔ سوسالیاں ایک طرف اور میں اکیلی ایک طرف (یہ اور بات ہے کہ حادثات زمانہ نے مجھے ان کی بیوی بنا دیا) میں جس دن ان کو نہ چھیڑوں' ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ''دشمنوں کے مزاج بخیر تو ہیں؟'' اسی قسم کی توجہ کے مرکز وہ اس کتاب میں بھی ہیں چاہے اسے ہیرو سمجھئے' چاہے ''ولن''

جواب نمبر ۲: ''سی ایس پی'' برادری چہ معنی دارد ہر سطح پر کنبہ پروری نے اس ملک کی لٹیا ڈبو دی ہے کوئی بھی سروس ہو خواہ پولیس' خواہ ریلوے' خواہ ہوابازی ہر فرد اپنا ضمیر' اپنا دماغ رکھتا ہے۔ سروس کی کوئی ٹریڈ یونین تو نہیں۔ اس کے علاوہ ایک سی ایس پی کو چورن کی چٹکیاں کھلائی قوی معدے کے لیے مفید ہی ہوں گی۔ کیونکہ اس کے انداز' بعض اوقات بہت ثقیل ہو جاتے ہیں۔ شاید اس قسم کے زود ہضم طنز سے وہ گر پالے کہ کائنات کا محور وہ نہیں ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

ہوائی

یہاں پر جب کسی کی ہوا بگڑتی ہے تو اسے "ہوائی" بھیجا جاتا ہے۔ میرے میاں سے صوبائی سرکار روٹھی تو یہ دلچسپ سفر بطور سزا عائد ہوا۔

ہوائی کے نام سے ذہن میں پکے پکے پپیتے اور کچی پکی گھاس میں لہراتی ہوئی لڑکیاں ابھرتی تھیں۔ گمان ہوا کہ امریکہ نے سیاحت کو سائنس بنادیا ہے اور پرچارک کو ایک آرٹ۔ کہیں ہوائی کی تعریفوں کے پل بھی اسی مبالغہ آمیز پروپیگنڈے کی کڑیاں نہ ہوں۔ کون جانے؟ چھوڑو!! لیکن صاحب ستنام محمود اور مسیح الزماں جیسے مہربان دوستوں نے وہ چشم دید حالات سنائے کہ ہمارے سر میں بھی ہوائی کی ہوا سما گئی۔ اچھا بھئی چلو۔

دنیا کے حسین سفر ہمیشہ مجھ پر مسلط رہے ہیں۔ یہ ایک اور سہی۔ کچھ اتنے لمبے ہوائی سفر کا ڈر۔ کچھ ایک صاحب نے ڈرایا کہ ٹوکیو سے ہونولولو تک نیچے بحرالکاہل ہوتا ہے اور اوپر خدا۔ کہیں زمین کا ذرا سا ٹکڑا بھی ڈھارس کے لیے دکھائی نہیں دیتا اور معمول کے مطابق اگر طوفان آجائے تو پھر الاماں! سفر اللہ اللہ کرتے گزرتا ہے۔ پیٹ میں ہول اٹھے' لیکن میرے میاں تو تین مہینے پہلے جاچکے تھے۔ اس لیے مراجعت ناممکن تھی۔ اوکھلی میں سر دیا تو اب دھکوں سے کیا ڈرنا۔ بوریا بسترا باندھا (بسترا تو ہوتا ہی نہیں' یہ محاورے کی بات ہے) گھر سمیٹ کر ایک گیراج میں بند کیا۔ گھر سمیٹنے میں میں اب طاق ہو گئی ہوں۔ اس طرح پل بھر میں اس کی گٹھڑی باندھ کر الگ کرتی ہوں کہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی جو اب کالج کے پہلے سال میں تھی' ساتھ ہولی۔ بڑی دو لڑکیوں کے بی اے کے امتحان تھے۔ ان کو ڈھائی مہینے بعد آنا تھا۔ کراچی پہنچ کر B.O.A.C. کا ٹکٹ بک کرایا۔ اس غریب لائن سے اگر جانا ہو تو چوبیں گھنٹے کی گنجائش رکھنی چاہیے۔ اگر ۲۶ کو جانا ہو تو ۲۵ کی سیٹ بک کراؤ۔ کیونکہ وہ چودہ سو چالیس منٹ سے کم لیٹ ہونا کسر شان سمجھتی ہے لیکن میں پھر بھی ہمیشہ اسی ہوائی کمپنی کو چنتی ہوں۔ کیونکہ اس کی نشست آرام دہ ہوتی ہے اور عملہ تمیز دار...... تو خیر ہم نے پہلی ٹیکی کلکتہ میں لگائی۔ کلکتہ میری جائے پیدائش ہے۔ حالانکہ میں صرف ایک سال کی شیر خوار وہاں سے لے آئی گئی تھی لیکن پھر بھی اس جگہ سے انس تھا۔ اس کو دیکھنے کا ارمان تھا۔ لیکن میرے جذبات نے مجھے ہمیشہ دھکے کھلوائے۔ ائیرپورٹ سے لے کر پولیس اسٹیشن تک جو میرا اور باقی مجھ جیسے سیاحوں کا حال ہوا وہ ناگفتہ بہ ہے۔ خدا کسی شریف انسان کو کلکتہ نہ لے جائے۔ اگر مرزا

KitaabPoint.blogspot.com

غالب نے اسی میں کچھ دیکھا تو ہندوستانی کسٹم آفیسر اور بنیا پولیس سے پہلے دیکھا ہوگا۔

قصہ کوتاہ ہم نے جلدی سے اپنی جان چھڑائی اور ہانگ کانگ روانہ ہوئے۔ وہاں جا کر روح خوش ہوجاتی ہے۔ دو دن میں تازہ دم ہو کر ٹوکیو روانہ ہوئے۔ راستہ سخت طوفانی تھا۔ کم بخت ''پین ایم'' پرانا کھٹارا جہاز چار گھنٹے لرزتا رہا اور ہمیں لرزاتا رہا۔ ڈر کے مارے آیت الکرسی بھول گئی۔ صرف ''کرسی کرسی'' زبان پر آ رہا تھا۔ ساتھ بیٹھا جاپانی تاہم تسلی دیتے ہوئے بولا۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ جب ٹوکیو سے ہوائی جاؤ گی تو ہوائی جہاز ایسے اچھلے گا جیسے بھاج میں گیہوں' ہم نے اناللہ پڑھ لیا اور ارادہ کرلیا کہ میاں کو ہوائی میں ہی رہنے دیں۔ اور ہم ٹوکیو میں ان کی واپسی کا انتظار کریں لیکن خاک چھاننے کا شوق خوف وخطر پر غالب آ گیا اور جنرل شیخ اور بیگم شیخ کی خاطر مدارات کا مزہ چکھ کر دو دن ٹوکیو ٹھہر کر جل تو جلال تو کہتے ہوئے جاپان ایئر لائنز میں بیٹھ گئے۔ ہوائی جہاز چلا تو ہم نے اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگی کہ یارب ہماری عزت رکھ لے اور خیر سے سفر پورا کردے۔ میرے مولا نے میری مراد ایسی پوری کی کہ سارا سفر آسمانوں پر ریشم کی طرح سرسر کرتا گزر گیا۔ میں نے اتنے خوشگوار چھ گھنٹے کبھی نہیں گزارے۔ مرد جاپانی ایئر ہوسٹس کو گھور گھور کر کھائے جارہے تھے اور میں بحرالکاہل کی گہرائیاں پی رہی تھی۔ رات کو ساڑھے دس بجے ہمارا جہاز ہوائی کے دارالسلطنت ''ہونالولو'' میں اترا۔ میاں کو تار دے دیا تھا۔ امید تھی کہ ہوائی اڈے پر ہار لے کر پہنچیں گے۔ جزیرہ ہوائی کی یہ ایک رسم دیرینہ ہے کہ ہر آنے والے کا پھولوں کے حسین گجروں سے استقبال کیا جاتا ہے۔ لڑکیاں ہار لے کر کھڑی ہوتی ہیں اور اترتے ہوئے سیاح کے گال پر مادرانہ بوسہ دے کر ہار ڈالتی ہیں۔ لیکن یہ سب تکلف مردوں کے لیے ہے۔ میری ذات کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اس لیے ارمان تھا کہ کم از کم میاں تو پھول نچھاور کرنے پہنچ جائیں گے لیکن میاں ریاض الدین صاحب حسب معمول غائب' رات کا وقت' مجھے ان کا پتہ بھی نہیں معلوم' جناب بلی کی طرح تین گھر تبدیل کرچکے تھے۔ ہوائی کی یونیورسٹی میں فون کیا تو انہوں نے کہا ''ایسٹ ویسٹ سنٹر'' سے پوچھو۔ اتنے میں ایک ٹیکسی والا آگے بڑھا۔ ''میں وہاں تک آپ کو لے جاتا ہوں' باقی پھر دیکھا جائے گا''

''ہائی رائز'' ہوسٹل تک پہنچے تو اونچی اونچی عمارات' بتیاں جل رہی ہیں۔ طلباء پڑھ رہے ہیں لیکن ہمارے میاں ندارد۔ غصہ اور پریشانی دونوں مل گئے۔ یہ اچھا استقبال ہو رہا ہے! رات کے بارہ بجے! تین مہینے بعد بیوی آئی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اتنے میں ایک کار لڑکیوں سے لدی پھندی چیختی چلاتی آن کر رکی۔ انجان شکلوں نے میرے گلے میں ہار ڈالے۔ پیچھے ایک کار' اس میں گٹار پر کچھ نوجوان ہوائی کے گیت گاتے ہوئے اترے اور ان نوجوانوں میں چھپے ہوئے میاں ریاض الدین مسکراتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں حسب معمول برستی' ان کی سہیلیوں نے سمجھایا کہ تار کے پڑھنے میں غلط فہمی ہوگئی۔ ہوائی کا وقت جاپان کے وقت

KitaabPoint.blogspot.com

سے ۲۴ گھنٹے پیچھے ہے۔اس لیے اکثر تاریخوں میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ہم نے جل کر کہا کہ اصل گڑبڑ تو ہماری شادی کی تاریخ سے شروع ہوئی تھی۔

بہرحال خدا کا شکرادا کیا' ٹیکسی والے کا شکریہ ادا کیا۔پھر گھر روانہ ہوئے۔رات کے اندھیرے میں بھی وائی کیکی کا ساحل کبھی نہیں سوتا۔سڑکیں روشن اور جواں دل روشن تر۔رات کو ایک بجے میرے لیے میاں کی سہیلیاں گرم مرغی کا روسٹ لائیں اور دودھ چاکلیٹ بنایا۔مجھے گھر دیکھنے کا شوق لیکن ریاض صاحب ٹالتے جائیں کہ تم صبح آرام سے دیکھنا۔ابھی کمروں میں بتی مت جلاؤ اور اس کی وجہ سمجھ میں آئی۔جب گھر کے ہر کونے میں منوں کوڑا اور گردوغبار دیکھا۔ہر دراز میں سے میلے موزے اور رومال' ہر جیب سے تھیٹر' سینما شو کی پرچیاں اور ریزگاری۔پنٹری میں پانچ دن سے برتن بغیر دھلے پڑے تھے۔میاں بجائے برتن دھونے کے نئے برتن نکال کر استعمال کرتے جاتے تھے۔اس طرح درجنوں موزے' رومال' بنیان خرید ڈالے تاکہ پرانے دھونے نہ پڑیں۔

بہرحال رات کو دو بجے تک اودھم مچتا رہا۔پھر ہمسائے کی گرجدار آواز آئی۔''خاموش'' ہم عموماً ہمسائے کی بات نہیں سنتے لیکن یہ ہمسایہ ہوائی کا مشہور پہلوان اور ہیوی ویٹ چیمپئن تھا اور نام بھی تھا' Hard Boiled Haggerty .... اس لیے اس کی ایک تنبیہ ہی کافی تھی۔دو منٹ کے اندر سب لڑکے لڑکیاں غائب۔خیر ہم تھکے ہارے سو گئے۔واللہ اعلم کب اٹھے' میاں دفتر جا چکے تھے۔ناشتہ خود بنایا۔زندگی میں پہلی دفعہ خود کھانا پکانا تھا۔پہلی دفعہ جب لندن امپریل ڈیفنس کورس پر لندن گئے تھے تو اپنا خانساماں ساتھ لے گئے تھے۔اس لیے کام کا پتہ ہی نہ چلا۔اب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا۔میری بیٹی ناز اور میں نے کمر کس کر سارا دن گھر کی صفائی کی۔اور لنچ قریبی ہوٹل میں جا کر کھایا۔رات کو بھی کچھ نہیں پکایا۔جالے' چیونٹیاں اور گرد ہٹا ہٹا کر کمر دکھ رہی تھی۔یہ جو میاں کی سات پشتوں پر احسان کیا تھا۔شام کو ہم جزیرے کا اولین معائنہ کرنے کار میں گئے۔ڈھلتے سورج میں بحرالکاہل کروٹیں بدل رہا تھا اور چاروں طرف زمردی آمریت مستحکم ہو چکی تھی۔تاحد نظر سبزہ ہی سبزہ۔یوں احساس ہوا کہ جزیرے ''اوواہو'' میں کہنہ مشق کائنات نئے سرے سے شباب پر آئی ہے۔اس کے ننھے منے رقبے میں فطرت کا ہر رنگ ہرانگ پایا جاتا ہے۔سمندر یہاں عمیق تر ہوتا چلا گیا ہے۔یہ جنوبی یورپ کے آبی کناروں (Riviera) سے زیادہ نیلا اور چمکیلا ہے۔دوپہر کے وقت اس نیلم کی بھڑک آنکھیں خیرہ کر دیتی ہے۔میں نے وجدانی حسن میں اس طرح ڈوبے ہوئے ساحل کم دیکھے ہیں۔ان کی ٹھنڈی عنبریں ریتیں گیلے بدن پر یوں پھسلتی تھیں جیسے ٹیلکم پاؤڈر۔

یہاں کے کوہساروں نے اس جزیرے کے گول چہرے کو ایک نیا زاویہ بخشا ہے۔یہ کہیں سنگلاخ ہیں اور کہیں اتنے سبز کہ ازلی

KitaabPoint.blogspot.com

برساتوں کا رین بسیرا معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی کنواری گھاس پر انسان اپنا سایہ ڈالتے جھجکتا ہے۔

اگلے دن ہم سب نے ''ہنوما بے'' پر پکنک منائی۔ یہ جگہ مجھے ایسی بھائی کہ دوڑی چھوٹی ادھر ہی کا رخ کرتی تھی۔ یہاں پانی سب سے مہذب اور شفاف تھا اور مجھ جیسی ڈرپوک تیراک بھی گھنٹوں ''سرف بورڈ'' پر لیٹ کر ''فلوٹ'' کرتی تھی۔ یہ ساحل آبی مخلوق کے لیے مشہور تھا اور ہر قسم کے حلیوں میں ''سنوکلر'' ماسک چڑھا زیر آب تحقیق کرتے رہتے تھے۔ ہوائی کی یونیورسٹی دنیا بھر میں علوم سمندر (Oceanography) میں سبقت لے گئی ہے۔

غرضیکہ اول تو قدرت نے اپنے حسن کے لنگر یہاں جاری کر دیے تھے جو کچھ کمی تھی وہ انسان نے پوری کر دی۔ ہوائی بھی خداوند عظیم اور اس کے نائب انسان کی مشترکہ سازش کا ایک جاذب نظر نمونہ ہے۔ اس شام ہم گھر کا سودا لینے ''سپر مارکیٹ'' گئے۔ بہت سے صاحبان اس ادارے کو جانتے ہیں لیکن بہت سی میری ہم وطن نہیں اس کے متعلق جاننا چاہیں گی۔ تو سنئے' سپر مارکیٹ امریکن سرمایہ داری کا مکمل مظاہرہ اور امریکن طرز حیات کا بنیادی قلعہ اور اس کی لامحدود افراط کا ذخار ہے۔ جب سے یہ بروئے زمین' برسر پیکار ہوا۔ ننھی ننھی دکانیں اور چھوٹے چھوٹے بساطی' پنساری دیوالیہ ہو گئے۔ یہ سپر مارکیٹ دس بازاروں کا مہا گرو ہے۔ ساری انارکلی اور مال روڈ کی دکانوں کا سامان اس کی ایک لپیٹ میں سما جائے۔ آپ جب داخل ہوں تو فوراً چار پہیوں والی ٹرالی ساتھ لے لیں کہ ہفتے دو ہفتے کا راشن اس میں ڈالتی جائیں اور جب خود چلتے چلتے تھک جائیں تو اس میں بیٹھ جائیں اور کسی اور سے کہیں کہ آپ کو کھینچے۔ صرف یہ آخری نصیحت میری اختراع ہے۔ ورنہ درحقیقت سپر مارکیٹ ایسی شیطان کی آنت ہے کہ دل چاہتا ہے' ٹرالی میں خود لٹک جائیں۔ اس ادارے کی افراط دیکھ کر انسان ایشیا' افریقہ کی بھوک اور قحط بھول جاتا ہے۔ اس جگہ بلا ارادہ اور بلا ضرورت خریداری کرنی پڑتی ہے۔ ہر شے کی پچاس قسمیں اور ہر قسم چھت تک چنی ہوئی۔ ہر دوسرے قدم پر SALE لکھا ہوا۔ غریب گھر گرہستن (سکھوں کی طرح) اگر گوس بری جیم نہیں بھی چاہیے تو وہ بھی پانچ بوتلیں خرید لیتی ہے کیونکہ سستی بک رہی ہے۔ اس کو انگریزی میں Complusive Buying کہا گیا ہے۔ اگر نقد نہیں تو ادھار لیجیے۔ لیکن لیجیے ضرور پھر لاٹری کی لالچ' ڈسکاؤنٹ کی لالچ' جو بھی ہو سپر مارکیٹ میں جا کر عورت کی آنکھیں اور بٹوے کھل جاتے ہیں۔ میں نے پہلے ہی ہلے میں ۳۲ ڈالر کی کھانے پینے کی چیزیں لے لیں۔ کار بھر گئی۔ اس سپر مارکیٹ میں الگ نرسری بھی ہوتی ہے جہاں عورتیں اپنے بچے چھوڑ کر اطمینان سے شاپنگ کرتی ہیں۔ لیکن ایک عورت نے اپنے ڈیڑھ سالہ بچے کی گردن میں کتے جیسا پٹہ ڈالا ہوا تھا اور اس کی زنجیر ٹرالی سے باندھی ہوئی تھی۔ وہ سرخ گول مٹول بچہ ماں کے پیچھے پیچھے زنجیر سے بندھا ہوا لڑھکتا چلا آ رہا تھا جیسے کوئی پالتو پلا ہو۔

KitaabPoint.blogspot.com

میاں نے ہمارے پیچھے کچھ گھر کا سامان خرید رکھا تھا۔ مثلاً

سیکنڈ ہینڈ کار (ایک عدد) جو دستی ہینڈل سے چلتی تھی۔

ٹیلیویژن (ایک عدد) جو دھموکوں سے بولتا تھا۔

صوفہ (ایک عدد) جس میں سے کھٹی کھٹی بھبھک اٹھتی تھی۔

گراموفون (ایک عدد) جس پر ہر مردانی آواز "پیارے صاحب" کی نسوانی مرکیوں کی طرح پھسلتی تھی۔

ٹیپ ریکارڈر (ایک عدد) جس پر صرف تین گانے بھرے جاسکتے تھے۔

باغ کی ہلکی کرسیاں (چار عدد) صرف یہ ابھی تک ساتھ دے رہی تھیں۔

اتنا سلیقہ میرے میاں میں کہاں سے آ گیا' مجھے نہیں معلوم! لیکن یہ سب ایک دکان کے توسل سے ہوا' جو غریب مفلوجوں اور یتیموں کے لیے چلائی گئی تھی۔ اس لیے میرے میاں نے خیرات کے جذبے میں اپنے گھر کو پھٹیچر سے بھر لیا۔ کار ۱۸۵۷ء کا ماڈل تھی۔ جب چلتی تھی تو دنیا دیکھتی تھی اور جب رکتی تھی تو دنیا شکر کرتی تھی۔ اس کے پراسرار پٹاخے نہ معلوم کہاں سے چھوٹتے تھے۔ ہم نے جاتے ہی کام بانٹ لیے۔ میں کھانا پکاؤں گی۔ بیٹی صفائی کرے گی۔ میاں بولے' ہم تمہاری ڈرائیوری کریں گے۔ ہم لاجواب ہو گئے۔ اس لیے کوئی اور کام ان کو نہ دیا کیونکہ اس کار کو چلانا انہی کا کام تھا۔ میں باہر ملک میں اگر کار چلاؤں تو کم سے کم مانوس ڈھانچہ تو ہو۔ اس کم بخت کے گیئر کدھر اور بریک کدھر۔ بالکل سرو پا۔ لیکن شاباش ہے۔ اس کار پر کہ ہزاروں میل سیریں کیں۔ لیکن اس نے ایک دفعہ بھی دغا نہ دی۔ پرانا ٹیلیویژن کچھ ایسا برا نہ تھا۔ وودھپ لگاؤ یا گرم کمبل ڈالو تو اس کے کالے سفید ترمرے ناچنے بند ہو جاتے تھے۔ پھر گھنٹوں صحیح چلتا تھا۔ جب تک کہ چینل نہ بدلو۔ چینل بدلی اور پھر وہی دھمو کے تھپڑ۔ گرم پانی کی بوتل' وہ پھر چل پڑا۔

تو صاحب یہ تو ہوائی کا ازدواجی رخ تھا۔ اب تک گرہستن ماں بیوی بول رہی تھی لیکن یہ گرہستن ماں بیوی دو وقت بلکہ اگلے دو دن کا اکٹھا کھانا پکا کر ریفریجریٹر میں بھر کر آزادی کا سانس بھی لیتی تھی۔ جگہ جگہ سیر پر خود نکل جاتی تھی۔ لائبریریوں سے گود بھر بھر جزائر ہوائی بلکہ سارے بحرالکاہل کے جزائر پر کتابیں لاتی تھی۔ آہستہ آہستہ لوگوں سے ملاقات' پروفیسر صاحبان سے گفتگو' سیاحوں اور طلباء سے میل جول' بہت اچھا وقت گزرا۔ ہونولولو کے مختلف مدارج ابھرنے شروع ہوئے اس کی ہمہ گوں زندگی کی چاشنی کی چسکا لگ گیا۔

ہوائی کی قدرت ساخت اور تاریخ انسانی پر نظر بعد میں ڈالوں گی۔ پہلے میاں ریاض الدین کی شان نزول بتاؤں۔ ہوائی میں

KitaabPoint.blogspot.com

امریکہ کی فیڈرل حکومت نے ایک عظیم الشان مرکز کھولا ہے جسے ''ایسٹ ویسٹ سنٹر'' کہتے ہیں۔اس کی حسین حدود اور عمارات میں مغرب اور مشرق کے عالم میں مدعو کے جاتے ہیں جو سینئر سکالر کہلاتے ہیں۔وہ مرکز کے خرچ پر آتے ہیں۔ہزار بارہ سو ڈالر کا وظیفہ ہر مہینے پاتے ہیں (اس ننھے سے وظیفے میں ایک خاندان ٹھاٹ کر سکتا ہے) دس مہینے یا سال کورس کی معیاد ہوتی ہے۔اس دوران میں جو مرضی آئے کیجئے' پڑھئے لکھئے' ریسرچ کیجئے' تاثرات قلمبند کیجئے' کوئی پابندی نہیں' کوئی امتحان نہیں' کوئی کلاس نہیں' کوئی وقت نہیں۔ میرے میاں اس آزادی پر مگن تھے۔آپ کا آرام دہ کمرہ۔ٹائپ رائٹر' غسل خانہ' بہترین لائبریری' ساتھ ہی سستا اور مزے کا ریستوران' اردگرد لڑکے لڑکیاں' آزادی کی فضا۔اکثر عالم سگریٹ کا دھواں اور غپ اڑاتے پائے جاتے تھے لیکن کوئی رپورٹ کرنے والا نہیں تھا۔کچھ عالم کتابیں لکھ بھی جاتے ہیں جو یہ مرکز بہت فخر یہ شائع کرتا ہے۔

اب ایک سی ایس پی کے لیے سینئر سکالر بننا بہت آسان ہے۔سینئر تو وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔جہاں تک مجھے یاد ہے' اسے کبھی بچپن میں بھی غلطی سے کسی نے جونیئر نہیں کہا۔اب رہا سکالر تو سی ایس پی کا بلا لگتے ہی وہ عالم بھی بن جاتا ہے۔ضلع میں ہر کتاب پر اسی کا پیش لفظ ہوتا ہے۔کالج کے ''کانووکیشن'' پر وہ عالمانہ تقریر جھاڑتا ہے۔اس کے فتوے پر نکاح ٹوٹتے ہیں اور ''بی ڈی'' جڑتے ہیں۔آرٹ کونسل' اسلامی مشاورتی کونسل' فلسفہ السنہ کی مجلسوں' سائنس کے ایوانوں کا چیئرمین اسی کرسی کا بندہ ہوتا ہے۔ اس لیے ایک سی ایس پی کے لیے ہوائی میں ''سینئر سکالر'' کہلانا کوئی معیوب یا مضحکہ خیز بات نہیں۔اس میں جو بھی ہو طنز ہرگز شامل نہیں۔خیر میاں ریاض الدین نے اس عالمانہ ماحول میں اس طرح غوطہ لگایا جیسے مچھلی اپنے مانوس پانی میں (لیکن اس مچھلی کو کبھی کبھی اپنی ''فائلات فائلا'' اور ''پی اے'' ضرور یاد آتا تھا)

ہاں تو ایسٹ ویسٹ سنٹر اور ہوائی کی یونیورسٹی میں یوں تو ارضی قربت ہے لیکن ازلی رقابت بھی ہے۔کسی حد تک یہ رقابت صحت مند بھی ہے۔امریکہ کے بہترین پروفیسر اور اعلیٰ ذہن سردی گرمی لیکچر کے لیے بلائے جاتے ہیں۔طرح طرح کی نمائشیں' فلم' جشن منائے جاتے ہیں۔اس کی جدید عمارات کے سامنے لمبی سے لمبی موٹریں جو آدھی طلباء کی اور آدھی پروفیسروں کی ہوتی ہیں۔امریکہ کی افراط کا صحیح ثبوت ہیں۔

اس مغرب و مشرق کے مرکز کا ایک جاپانی باغ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔یہ اتنا ایمان شکن ہے کہ میں اکثر لائبریری جاتے جاتے اس میں گھس جاتی تھی۔جزائر ''ٹھیٹی'' کے پھول خصوصا ''گارڈینیا'' زرد چمپلی' کنول' کچا کچا سبزہ' نڈھال پانی اور رنگین مچھلیاں اور اس کی پشت پر ممنوع درختوں کا ذخیرہ۔

KitaabPoint.blogspot.com

اس ایسٹ ویسٹ سنٹر کے علاوہ یونیورسٹی کا میلوں میں پھیلا ہوا احاطہ بھی ایک دیدہ زیب سبزہ زار ہے۔ ہر قدم پر گل آویزاں روشیں اور بتدریج باڑیں۔

لیکن اس کے علاوہ جو سب سے دل پذیر عنصر اس فضا میں پایا جاتا تھا' وہ تھا بین الاقوامی طلباء کا ربط ضبط۔ جنوبی بحرالکاہل سے لے کر جاپان' انڈونیشیا' برما' ملایا' فلپائن' کوریا' ویت نام' فیجی کے جزائر' آسٹریلیا' پاکستان' ہندوستان' یورپ اور امریکہ کے جواں سال جوئندگان علم! یہ معاشرتی تنوع بھی ایک تعلیمی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں بھانت بھانت کے لڑکے لڑکیوں سے ملنا جلنا۔ تبادلہ خیالات کرنا۔ طرح طرح کے کھانے' طرح طرح کے گانے' طرح طرح کے رقص' ہنستے کھیلتے انسان' بے شمار باتیں سیکھ لیتے ہیں۔

پہلے ہفتے ہی ایسٹ ویسٹ سنٹر نے اپنی مشہور تعارفی رات منائی۔ یہ جشن کی طرح منائی جاتی ہے اور ہوائی زبان سے اسے Luau کہتے ہیں۔ سارا مرکز پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ مختلف پھلوں کے رس سے بنائی ہوئی ''پنچ'' کے جام چل رہے تھے۔ ہلکی ہلکی مشعلیں' رنگین قمقمے اور موم بتیاں جل رہی تھیں۔ جاپانی باغ میں دور دور آراستہ میزیں' میزبانوں اور مہمانوں سے تعارف کراتے کراتے ہمیں اپنی نشست پر لایا گیا۔ طعام شروع ہوا۔ مدھم سروں میں ''اوک لیلی'' پر دھنیں بج رہی تھیں۔ سب سے پہلے ہمارے سامنے ہوائی کی مشہور ڈش لوی لوی آئی۔ یہ ٹماٹر کا کچومر تھا جس میں سامن مچھلی کا بھرتہ ملا ہوا تھا۔ کیونکہ نام ہی ''لوی لوی'' تھا اور مزا بھی اس سے وابستہ' لہٰذا وہ ڈش چٹم کر گئے اور یہ بھی جان بوجھ کر بھول گئے کہ ہم برہمن ہیں اور کچی مچھلی نہیں کھاتے۔

پھر اگلی ڈش اس سے بھی زیادہ پر اسرار تھی۔ ساگ میں لپٹا ہوا ہرا ہرا لڈو ہمارے سامنے آیا۔ بتایا گیا کہ یہ ساگ نہیں ہے بلکہ ''ٹی پات'' ہیں جس میں مرغی دم دی گئی ہے۔ ساگ کو ہٹایا تو بیچ میں سے گرم گرم نہایت مزے دار گوشت نکلا۔ یہ گوشت ''ایمو'' یعنی پتھروں کے تندور میں پکایا جاتا ہے۔ ہم بہت متاثر ہوئے۔ بعد میں کسی شریر نے سرگوشی کی کہ یہ خنزیر ہے۔ ہم نے کہا' جو بھی تھا بہت لذیذ تھا۔ بہرحال اب تو ''ایمان می خورم'' کیا ہوسکتا ہے۔ عموماً یہ ڈش سور کے گوشت سے بنتی ہے لیکن اس رات مرغی سے پکائی گئی تھی۔ اس کے بعد ناریل کے دودھ سے پکی ہوئی سفید لوزاتیں آئیں۔ یہ فوراً منہ میں گھل گئیں۔ خیر صاحب بعد از طعام جشن رقص و سرود منعقد ہوا۔ ہوائی کا بہترین طائفہ سلام کے لیے سامنے آیا۔ اس کی پیش رو ایک جامہ زیب مادام تھیں۔ جن میں مشرق کا نمک بہت حلول کر چکا تھا۔ اس ٹیم نے ہوائی کے روایتی لوک گیت اور رقص دکھائے۔ یہ اندازہ ہوا کہ ہوائی کی موسیقی میں تنوع ذرا بھی نہیں ہے اور نہ ہی زیادہ اتار چڑھاؤ....... کیونکہ اس موسیقی کی بنا مذہب سے ہوئی اور ان کے دیوتاؤں کے حضور میں یہ گانے منتروں کی طرح پڑھے جاتے تھے۔ اس لیے یہ آج بھی وہی منتر لگتے ہیں۔ ریں ریں ریں ریں ریں....... ایک صوتی رہٹ چل رہا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

طبیعت بدمزا ہوگئی۔ خیران کی موسیقی کے مختلف ساز ہمارے لیے ایک دریافت ہی تھے۔ ''اکلیلی'' ایک گیتار کی طرح ہوتی ہے صرف چار تار ہوتے ہیں اور یہ بخوبی ہوائی موسیقی کے تقاضے پورے کر لیتی ہے۔ دوسری بانس کی تراشی ہوئی چھڑیاں ہوتی ہیں ان کے چھناکے سے تال دی جاتی ہے۔ ان کو'پوالی'' کہتے ہیں ہمارے طبلے کی جگہ ان کے پاس دو سوکھے سوکھے کدو ہیں جنہیں وہ زمین پر تھاپ دیتے ہیں اور طبلے کا نام''ای پُو'' ہے۔ ہسپانوی Castanets کی جگہ ان کے پاس ننھے ننھے پنکھے ہیں۔ اور ان سے وہی کٹک کٹک تال ملتی ہے۔

ہوائی کا ناچ جو''ہولا'' کے نام سے تشہیر پا چکا ہے۔ ایک سویا سویا کھویا کھویا رقص ہے جسے بے آواز لوری کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ دھیمے دھیمے ہاتھ اور دھیمے پیر جو ہلتے بھی نہیں۔ ننھی ننھی نحیف موجوں کی طرح جو ابھرنے سے پہلے ڈوب جائیں۔

اگر اصلی جاندار''ہولا'' دیکھنا ہو تو جزائر تہیتی (Tahiti) کا دیکھو۔ سویا انسان جاگ اٹھے اور جاگا انسان پھڑکنے لگے۔ یہ مشکل فن ہے جو مصری ''بیلی ڈانسر'' سے کسی طرح کم نہیں۔ تکنیک ایک ہی ہے۔ فرق صرف جسم کے جغرافیہ کا ہے۔ مصری ناچ میں صرف پیٹ پھڑکتا ہے۔ ''تہیتین'' ہولا میں صرف کولہے' اوپر کا حصہ ساکت اور صرف کمر کے نیچے زلزلہ آیا ہوا۔ رگ رگ پھڑکتی ہے اور موسیقی تیز سے تیز تر اور رقاصہ کا جوبن پرا کر تھرکنا خوب تر۔ لطف آ گیا۔ ہم تو مرنے سے پہلے تہیتی ضرور جائیں گے۔ یہ خواہش ہم اکثر اسی انداز میں کرتے ہیں کہ ایک دن ہمارے میاں زچ ہو کر بولے' تمہارے مرنے میں کافی وقت ہے اور کرۂ ارض کے فاصلے کم ہوتے جا رہے ہیں' اس لیے کوئی ارمان نہ رکھو۔''

ابھی تک تو میں اپنی بے تکی بڑہانک رہی تھی لیکن جزائر''ہوائی'' بلکہ سارے جزائر جنوبی بحرالکاہل کو سمجھنے کے لیے اس کا تاریخی پس منظر جاننا ضروری ہے چونکہ تاریخ کا انسان سے واسطہ ہے اس لیے جب انسان برسرپیکار ہوتا ہے تو مورخ قلم سنبھال لیتا ہے لیکن تاریخ سے بھی پہلے ایک خاموش ڈراما بروئے کار آتا ہے جس کا چکر ہزاروں نہیں بلکہ کروڑوں سال کا ہوتا ہے اور وہ ہے ارضیات' Geology

جزائر''ہوائی'' مٹی کی ننھی ننھی بوندیوں کی طرح پچھلے چالیس ہزار سال سے اس بیکراں سمندر میں کئی دفعہ ابھرے اور کئی دفعہ ڈوبے۔ لیکن شاباش ہے وقت کو! اس کا صبر! اس کا ظرف غیر محدود ہے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا۔ اور یہ نامعلوم کاہل جزیرے جن کے سینے میں آ گئے اور جن کی سطح پر جڑ گیا وہ کچھ نہ تھا۔ بتدریج اوراق ہستی پر ایک اہمیت اختیار کرتے گئے۔

اکثر مورخوں کا کہنا ہے کہ جنوبی اور مشرقی ایشیا سے من چلے ملاحوں کے خاندان جوق در جوق کشتیوں میں اپنا سارا متاع حیات

KitaabPoint.blogspot.com

رکھ کر وقتاً فوقتاً ان جزائر میں بستے گئے۔ عقل دنگ ہے کہ پندرہ سو سال پہلے جب جہاز رانی اپنی ابتدائی منزل تک نہیں پہنچی تھی۔ یہ نڈر ایشیائی ان نازک چوبی سفینوں میں کس طرح اس اژدھے کو پار کرتے ہوں گے جو سارا وقت جبڑا کھولے نگلنے کو تیار ہے۔ واللہ اعلم اس کو بحرالکاہل کس نے کہا۔ بے چین روح ہر وقت طوفان کے سر پر سوار رہتی ہے۔ خیر تو شاباش ہے۔ ان سیلانی جیوڑوں پر جو نہ صرف خود آ کر بسے بلکہ اپنے ساتھ کشتیوں میں ایشیا کے پھل پھول اور نباتات بھی رکھ لائے۔ گائے بکری بھی لے آئے اور کچھ دستی ہنر بھی پار کر لائے۔

ایک دو مورخوں کا کہنا ہے کہ یہ "پولی نیزین" (Polybnesians) اصل میں وہ شمالی انڈین تھے جو موجوں کی صورت میں رہ رہ کر امڈتے اور کینیڈا' امریکہ اور لاطینی امریکہ میں بستے گئے۔ انہی کا بچا کھچا بیڑا جزائر ہوائی تک بھی آیا۔ لیکن نہ مجھے اس نظریے سے اتفاق ہے نہ عموماً مورخوں کو۔ کیونکہ پھل پھول' سبزیاں وغیرہ جو بھی ان جزائر میں پائے جاتے ہیں' سب جنوبی ہند کے ہیں تو یہ "پولی نیزین" بہت مہذب اور امن پسند تھے۔ آپس میں ان کی تقسیم "چوہدراہٹ" کی بنا پر ہو گئی۔ کوئی ایک جزیرے کا ننھا سا راجہ بن گیا کوئی دوسرے کا۔ لیکن خونریزی معیوب اور معدوم تھی۔ گو یہ قومیں بت پرست اور نیم برہنہ تھیں۔ لیکن ان میں ایک اخلاقی شائستگی حیا اور اصول تھے۔ ان معصوم قبیلوں کو ان فرنگیوں نے آ کر خوب پٹی پڑھائی اور کیا کیا عطیات دیئے۔ مثلاً سامراجی سازش اور جنگ وجدل' فولادی اور بارودی ہتھیاروں کا استعمال۔ حرص زن وزمین' اور ہر نوع کے امراض "پولی نیزین" بہت خوش باش اور صحت مند تھے۔ جب اٹھارہویں صدی میں سفید چمڑی نے ان کی طرف رخ کیا تو بے چاروں کو ہر قسم کا جسمانی اور روحانی روگ لگا دیا۔ اگر ۱۷۷۸ء میں ایک منچلا کیپٹن کک ان جزائر کو دریافت نہ کرتا تو انسانیت پر بہت احسان کرتا۔ یہ کپتان اپنی ملکہ الزبتھ کا پرچم لے کر سب مظلوم اور نہتے جزیروں کو اسیر کرنے نکلا ہوا تھا۔ جب جزائر ہوائی پہنچا تو دور بیڑا روک کر بہر ملاقات سرداروں کو سلام بھیجا۔ اسی اثنا میں ہوائی کے صنم کدوں میں ایک پیشین گوئی ہو چکی تھی کہ آکاش سے ایک دیوتا آنے والا ہے۔ یہ بھلے مانس کیپٹن کک کو دیوتا سمجھ بیٹھے اور کئی ہفتے اس کی اور اس کے جہاز رانوں کی خوب آؤ بھگت کی۔ ان کی کشتیاں میٹھے پانی' پھل اور صندل جیسی قیمتی پیداوار سے بھر دیں۔ حتیٰ کہ اپنی دوشیزائیں بھی اس دیوتا کے سامنے پیش کر دیں لیکن انہی دنوں ایک مہلک وبا سے کئی اموات ہو گئیں۔ جزیرے کے باشندوں نے کیپٹن کک کو فرمائش کی کہ اگر تم دیوتا ہو تو اس وبا کو روکو۔ اب تو دیوتا کو اپنا بوریا بستر سمیٹنا پڑا۔ ادھر ان باشندوں کی پرستش میں بھی خلل آ گیا۔ چونکہ ان جزائر میں فولاد بالکل نہیں تھا' اس لیے باشندوں نے اپنے دیوتا کے جہاز میں سے دو کشتیاں چرا کر جلا دیں تاکہ لوہے کی کیلیں نکال لیں۔ اس بات پر جھڑپ ہو گئی۔ کپتان نے حملے کا حکم دیا۔ ادھر ایک تیر خود

KitaabPoint.blogspot.com

کپتان لگ گیا جس سے وہ کراہنے لگا۔ باشندوں کو احساس ہوا کہ یہ کپتان دیوتا نہیں ہو سکتا۔ دیوتا تو کراہتے ہی نہیں۔ اتنا سمجھنا تھا کہ باشندے "کیپٹن کک" پر پل پڑے اور اس کی بوٹی بوٹی کر ڈالی البتہ برائے پرستش اس کی ہڈیاں مختلف مندروں میں بھجوا دیں۔

اس سانحہ کے بعد جزائر نے فولاد کی اہمیت پہچانی اور فولاد ہر قیمت پر خریدنا شروع کر دیا لیکن فرنگی صرف سپاہی نہیں بلکہ بیوپاری بھی ہوتا ہے۔ بیوپار میں بھی مات دے گیا۔ ذرا ذرا سے لوہے کے ٹکڑوں کے عوض منوں کیوڑہ زعفران اور صندل بٹور کر لے گیا۔

اس کے بعد ان جزائر کی آبادی نصف رہ گئی۔ حالانکہ پولی نیزین بہت زور آور اور جسیم تھے لیکن نازک طبع اور حساس بھی تھے۔ سمندری اور سامراجیوں کی وحشت اور ان کے بخشے ہوئے امراض سے آدھے باشندے چٹ پٹ ہو گئے۔ رہی سہی کسر امریکیوں نے پوری کر دی۔ بقیہ ممالک تو صرف لوٹ کر آگے بڑھ جاتے تھے امریکہ کے یانکی (Yankee) نے کھسوٹا بھی اور پھر دھرنا مار کر بیٹھ بھی گیا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اپنے ساتھ تبلیغی جماعتیں بھی لے آیا جنہیں "مشنری" کہا جاتا ہے۔ دنیا میں مغرب کی کامیابی کا راز آہنی مشینری اور کلیسائی مشنری ہیں بلکہ یہ مشین سے پہلے پہنچ کر اپنے مشن کھول لیتے ہیں اور مغربی تسلط کے لیے معاشرے کی زمین تیار کر لیتے ہیں۔ بقیہ ممالک میں ان مبلغوں نے اگر برے کام کئے ہیں تو بے شمار اچھے کام بھی کئے ہیں لیکن ہوائی میں ان مشنریوں کا اعمال نامہ ضرورت سے زیادہ سیاہ ہے۔ یہ اپنے دعوے کے مطابق کافروں کو خدا سے متعارف کرانے آئے تھے۔ ان کے نیم برہنہ جسم سے گھاس کی گھگریاں اتار کر اپنے "گاؤن" پہنانے آئے تھے۔ بہ الفاظ دیگر اپنا برتر معاشرہ جہازوں پر لاد کر لائے جو ان کے سر منڈھ دیا مگر اپنا مذہب بیچتے بیچتے خود ہوائی کی سب جاگیریں خرید لیں۔ آج تک ان جزائر میں یہ لطیفہ زبان زد خاص و عام ہے کہ مشنری آئے۔ ہم باشندوں سے واعظ میں کہا۔ "آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑ کر خدا سے لو لگاؤ اور آسمان کی طرف منہ کرو۔" جب ہم نے آنکھیں کھولیں تو ہماری زمینیں غائب تھیں۔ یہ حقیقت نہ صرف جمز مچ نے اپنی مشہور کتاب میں کہی بلکہ ڈاکٹر فیوکس نے بھی اپنی ضخیم اور لاجواب کتاب میں اس کی تائید کی ہے۔ گو ہوائی کے دیرینہ مشنری خاندان ان اشاعتوں سے بہت نالاں ہیں اور کوشاں ہیں کہ کم سے کم ڈاکٹر فیوکس کی کتاب باقی ملکوں میں نہ جائے۔

ہوائی کی پرانی تاریخ کا آخری دور ۱۸۳۵ء سے ۱۸۹۵ء تک شہنشاہیت کا تھا جو امریکی صلاح کار اور وزراء کے بل بوتے پر چلائی گئی۔ مختلف بادشاہ اپنے مقررہ وقفے کے لیے آئے اور راج کر کے چلے گئے یا ہٹا دیئے گئے۔ اس دور میں امریکہ کے تاجروں کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔ اس لیے ہر حکمران ان کے اشارے پر ناچتا تھا۔ آخری ملکہ "للیو کلیانی" نے ذرا خود مختاری دکھائی تو اس کو زبردستی دیس نکالا مل گیا۔ اس وقت تک امریکہ کا سرمایہ ہوائی کی زراعت اور صنعت پر غالب آ چکا تھا۔ گنے اور اناناس کے بیوپار

KitaabPoint.blogspot.com

میں یہ یانکی کروڑ پتی ہو چکے تھے۔ کھیتوں پر کام کرنے کے لیے چین، کوریا، فلپائن سے لاکھوں مزدور پابہ زنجیر پکڑ کرلائے گئے تھے۔ ان مزدوروں کے خون پسینے سے ہوائی کے سفید سیٹھ Sugar Barons دنیا میں ایک محاورہ بن گئے۔ ڈاکٹر لنڈ نے اپنی کتاب میں انہیں "The Tightest Economic Oligarchy in the World" کہا ہے۔ ان مشرق بعید کے زرخرید مزدوروں سے ہوائی کی ماڈرن تاریخ کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔ یہ ایشیائی فرقے ایک نسل تک تو فاقے کرتے اور کوڑے کھاتے رہے لیکن اپنی محنت جفاکشی اور ایثار سے پچاس سال کے اندر اندر مزدور طبقے سے متوسط طبقے میں شامل ہو گئے۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے جاپانیوں پر بہت شکوک کئے گئے اور بے جا مظالم بھی ہوئے لیکن آفرین ان ایشیائی مزدوروں کا کہ اس صبر اور ہمت سے انہوں نے سر جوڑ کر سفید یہودیوں اور سود خوروں کا مقابلہ کیا ہے کہ آج ہوائی کا ساٹھ فیصد کاروباری انتظام (پیسہ نہیں) چینیوں کے ہاتھ میں ہے۔ حالانکہ وہ وہاں کی آبادی میں آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتے ہیں اور کل چھ فیصدی ہیں۔ چینیوں کی شرح آمدنی ہوائی میں فی کس سب سے زیادہ ہے۔ یہ قوم بہت محنتی اور علم جو ہے۔ حالانکہ ان کی اقتصادی شروعات ادنیٰ 'مشترکہ بیوپار کریڈٹ یونین اور انجمن امداد باہمی چھوٹے چھوٹے بینکوں سے ہوئی۔ آج یہ سب گندمی اور پیلی چڑیاں مل کر امریکی سامراج اور امریکی سرمایہ داری کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

اور آج چینی جاپانیوں کا اپنا الگ چیمبر آف کامرس اور اپنا ایک الگ بینک ہے۔ بظاہر امریکہ دعویٰ کرتا ہے کہ ہوائی میں یک جہتی ہے' ملاپ ہے' لیکن سطح کے نیچے بہت تلخ یادیں وابستہ ہیں۔ جاپانی بھول نہیں سکتے کہ پچھلی جنگ میں ان کی جواں پلٹن اس لیے جرمنی جرنیل رومیل کے خلاف کٹوادی گئی تھی تاکہ بھاگتی ہوئی امریکی فوج کو آڑ مل سکے۔ نہ یہ ایشیائی قومیں وہ ذلت اور غربت بھولی ہیں جو ان کے آباء واجداد کو سہنی پڑتی تھیں اور نہ وہ اداس دھونس کو بھول سکتے ہیں جو سارے وقت ان کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ وہ ذرا بھی سست پڑے تو وہ سفید سرمایہ ان کو ہڑپ کر جائے گا۔ سیاست میں ان کی تعداد معنی رکھتی ہے مثلاً آبادی میں جاپانی تیس فیصد ہیں اور چینی چھ فیصد۔ باقی مختلف ممالک کے لیکن سفید باشندے ہیں جنہیں ''کوہ قافی'' (Cau Casians) کہا جاتا ہے اور یہ تیس فیصدی سے زیادہ ہوتے جارہے ہیں اور امریکی پالیسی کا خاص مقصد یہ ہے کہ چپکے چپکے سفید افراد کو ہوائی سمگل کیا جائے تاکہ الیکشن میں سفید ''ووٹیں'' غالب رہیں۔ ان خوف وشکوک کی حالت میں ایک اندرونی ہیجان اور تناؤ ہے جو عام سیاحوں کو نظر نہیں آتا۔ بظاہر تو سب نکٹے چپٹے پیلے گورے ایک ہی معاشرے کا شکار نظر آتے ہیں لیکن اس ''سینوچ کلچر'' کی زیر سطح دھیمی دھیمی آگ سلگ رہی ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

خیر تو قصہ مختصر ۱۸۹۸ء میں امریکہ کو ہوائی کی کاروباری اہمیت کے علاوہ اس کی بین الاقوامی حیثیت کا بھی اندازہ ہوا۔ اور آخری جنگ میں ''پرل ہاربر'' کے سانحے کے بعد امریکہ نے عہد کرلیا کہ اسے اپنی ایشیائی بحری طاقتوں کا آخری قلعہ بنائے گا۔ برسوں کی تگ ودو کے بعد ۱۹۵۹ء میں صدر ''آئزن ہاور'' نے ہوائی کو امریکہ کی پچاسویں ریاست بنانے کا اعلان کر دیا۔ اللہ بھرتے کو بھرتا ہے۔ اس صدی میں جب باقی سامراج افریقہ' ایشیا سے اپنے پنجے نکال رہے ہیں' امریکہ اپنی سلطنت بڑھاتا جارہا ہے۔ ہوائی سے پہلے ''الاسکا'' بھی دبوچ لیا تھا۔ اس طرح فلپائن' تھائی لینڈ' ویت نام' لاؤس وغیرہ بھی رکوع میں جارہے ہیں اور جو نظر آرہا ہے انشاء اللہ ہندوستان بھی امریکہ کی آخری فتح اور ۵۲ ویں ریاست ہوگی۔ یہ تو تھی اس آبی قوم کی خشک اور سرسری داستان!

ہوائی میں ایک کھیل بہت مزے سے کھیلا جاتا ہے۔ وہ ہے ''بوجھو تو جانیں'' آپ کسی فٹ پاتھ پر ایک طرف کھڑے ہو جایئے اور راہرو کے صرف چہرے کو دیکھ کر پہچانئے کہ اس فرد میں خون کی کتنی بوندیں چینی' کتنی جاپانی' کتنی یورپی اور کتنی امریکی ہیں۔ ریسرچ کے عالم بتاتے ہیں کہ ان ننھے منے جزائر میں ۱۵۲ قسم کے مختلف چہرے اور نسلیں ہیں۔ اصلی باشندے تو صرف ایک فیصد رہ گئے ہیں لیکن انہوں نے دو صدیوں سے بیرونی قوموں سے ناطے جوڑ کر اپنے محدود خون کو لاکھوں ذاتوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اگر اتفاق سے آپ کو کیلے کے درخت برابر لمبا اور بڑ کے درخت برابر چوڑا گندمی رنگت کا مرد نظر آئے جس کے ہونٹ موٹے موٹے۔ بال ملکے گھنگھریالے اور تقریباً کالے ہوں۔ آنکھیں گول گول مگر ناک سے دور دور ہوں تو یہ ہے اصل نسل' ہوائی کا رہنے والا۔ لیکن ایسے صرف دو چار ہی ہیں جو تھیٹر تماشوں میں برائے نمائش سجائے گئے ہیں۔ کچھ ضعیف عورتیں بھی کبھار مل جاتی ہیں اور وہ اس طرح آہیں بھر کر ہوائی کی پرانی عظمت اور آزادی کا ذکر کرتی ہیں جس طرح ہماری نانی دادیاں اصلی گھی اور سفید گھوڑوں کی فٹنوں کا۔ یہ ہوائی کے وہ محدود چند اداس چہرے ہیں۔ جنہوں نے نئے دور اور نئی اقدار کے ساتھ کسی قیمت پر مطابقت نہیں کی۔ یہ امریکنوں کو ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوستے ہیں۔ اس اصلی اقلیت کو پہچاننے کے بعد آپ کا اللہ حافظ' ہر فرنگی منچلے کا رومان یا بسیرا۔ کوریا سے لے کر ٹونگا لینڈ تک اور ہالینڈ سے لے کر جرمنی تک ہر غلام مزدور کا عقد یا نقد وہ رنگ لایا ہے کہ بھانت بھانت کے ان مل' بے جوڑ نقوش و رنگین جسم چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نسلی تنوع ہوائی کا سب سے بڑا معرکہ اور سحر ہے اور اس کی سب سے دلچسپ بھول بھلیاں! حالانکہ یہ سب قومیں اب اتنی مخلوط ہوگئی ہیں کہ اپنی اصلیت کھو بیٹھی ہیں لیکن پھر بھی ہر گھرانہ اپنے آبائی ملک کی یاد میں کوئی نہ کوئی رسم اور رواج برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جاپانی اپنے جنت رسیدہ بزرگان بون رقص کے ساتھ مناتے ہیں جس میں بانسریوں کی دھنیں اور ننھی ننھی مشعلیں' کشتیاں' پانی میں تھرکتی ہیں۔ چینی اپنا سال نو گل نرگس کے جشن سے مناتے ہیں اور اس میں اژدھوں اور ارنی گھوڑوں

KitaabPoint.blogspot.com

والے رقص کرتے ہیں۔

جس طرح ایک پاکستانی امریکہ فتح کرلے تو وہاں کے ایک چوک کا نام گھنٹہ گھر رکھے گا' اور کسی سڑک کا نام بندر روڈ۔ اسی طرح ان لوگوں نے بھی ہوائی میں اپنی جدی یادگاریں بنائی ہوئی ہیں۔ شہر کے اندر ایک ننھے سے محلے کا نام ''چھوٹا ٹوکیو'' ہے۔ ایک کا عنوان ہے ''ننھا منیلا'' ایک اور گلی جس میں سوئے سوس (Soy Savce) کی خوشبو آتی ہے۔ ''چائنا ٹاؤن'' کے مانوس نام سے مشہور ہے۔ یہ محلے اپنے اپنے معاشرے کی حفاظت میں ڈٹے ہیں اور امریکی یلغار جس کا نام کوکا کولا اور ہیم برگر اور جینز ہے۔ دور رکھنے کے لیے کوشاں ہے۔ ان فرقوں کے اپنے اپنے کلب ہیں جن میں غیر مشکل سے باریابی پاتے ہیں۔ حالانکہ آپس میں ازدواجی اختلاط بڑھتا جا رہا لیکن پھر بھی جاپانی ماں پسند نہیں کرتی کہ اس کی بیٹی فرنگی کے ساتھ شام گزارے اور امریکی خاندان اپنے لڑکے چان یا ''سموا'' کی دوشیزہ کے ساتھ میل جول قبول نہیں کرتا۔ میرے خیال میں ایک نسل کے بعد یہ سب اختلافات اور تعصبات غائب ہوں گے اور کیا معلوم شاید بڑھ جائیں۔ افسوس کہ سیاست اور اقتصادیات نے انسانیت کی تلخی کو کم کرنے میں بھی کوئی مدد نہیں کی۔

جہاں اتنی قومیں ہوں وہاں اتنے ہی مذاہب بھی ہوں گے۔ ہوائی کے دارالسلطنت میں ایک جگہ چھ میل کے اندر اندر ایک کلیسا' ایک بدھ مندر' ایک مورمن کا عبادت کدہ' ایک شنٹو کا جاپانی روح کدہ' ایک بہائی کا مجلس کدہ' ہوائی مذہب کا صنم کدہ' آریہ پوجا گھر ہے۔ بہائی مذہب جوان طلباء میں بہت ہر دلعزیز ہو رہا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کوئی صوم وصلوٰۃ کی پابندی نہیں ہے۔ ویسے بھی ہوائی میں تنگ نظری مفقود ہے۔ اکثر افراد کے ایک ہاتھ میں انجیل ہوتی ہے اور دوسرے ہاتھ میں زین بدھ ازم کی کتاب۔

کل ہوائی سات جزائر پر مشتمل ہے جو دنیا کے نقشے پر اتنے معدوم نقطے ہیں کہ عقل دنگ ہے کہ یہ دریافت کیسے ہوئے۔ باقی جزائر پر انسانی آبادی نہیں ہے۔ وہ حرف غلط کی طرح ابھرتے اور مٹتے رہتے ہیں۔ ان سات جزائر میں سے ''اووا ہو'' اس لیے مشہور ہے کہ اس کا مرکز ہونالولو ہے جس کے نام سے ہر سیاح کے دل میں ولولے جاگ اٹھتے ہیں۔ اس کا ذکر تو فرصت سے بعد میں آئے گا۔ ان جزائر کی سحر انگیزی کا راز یہ ہے یہ سب خوابیدہ آتش فشاں ہیں۔ ان کی حرارت میں ہر ٹروپیکل پیداوار پر پھل پھول اگتے ہیں۔ ان کی بعض برفانی کلغیوں پر سرد ممالک کے برگ وگیاہ پائے جاتے ہیں۔ ان جزائر کی ننھی سی جانوں میں اتنا موسمی تنوع ہے کہ آدھ گھنٹے کی کار کی دوڑ میں سویٹر پہن لیجیے اور رات کو صحن میں آگ جلائیے اور یا آدھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد سب کپڑے پھینک کر پیراہن پیرا کی پہنئے اور نیلے پانیوں میں کود جائیے۔ لکھنے کو تو انسان بہت کچھ لکھ سکتا ہے لیکن اختصار کے تقاضے کے ماتحت چند سطور ہر

KitaabPoint.blogspot.com

جزیرے پر لکھی جا سکتی ہیں۔

ہوائی...... اس کو بڑا جزیرہ (Big Island) کہتے ہیں لیکن میں اس کو گلستانوں کا قلب کہوں گی۔ تمام امریکہ اور باقی دنیا کو پھول اسی جزیرے سے برآمد ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کی نرسریوں میں گل و شجر کی بائیس ہزار اقسام ہیں۔ جہاں تک نظر جاتی ہے پھولوں کی کیاریاں ہی کیاریاں ہیں۔

اس کے دو بیدار جوالا مکھی بے ضرر ہے لیکن بے زر نہیں۔ امریکنوں کی طرح انہیں بھی پیسہ کمانا آتا ہے۔ جب ان سے آتشبازیاں پھوٹتی ہیں تو چھ چھ دن سارے جزیرہ کا ٹریفک بند ہو جاتا ہے اور ہر سیاح اس آتش زاد دیوی کے درشن کے کیمرے اور دوربینیں لے کر پہنچ جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ آتشیں فوارے ۷۰۰ افٹ تک کی بلندی پر چھوٹتے ہیں اور مردہ مٹی پر لاوا کے زعفرانی مرغزار پھیلاتے ہیں۔

ماوی (Mavi)...... ہوائی کے سات جزیرے سات سہاگنوں کی طرح ہر سنگھار سے مزین ہیں۔ لیکن ان سات سہاگنوں میں اگر کوئی نمایاں طور پر حسین ہے تو وہ ''ماوی'' ہے اس کو تضاد کا جزیرہ کہتے ہیں۔ کیونکہ دو آتش فشاں پہاڑوں کے بیچ میں سرخ زمین کی وادی ہے جس کے ایک طرف خشک ویران صحرا ہے۔ دوسری طرف ہر وقت بارش ہوتی رہتی ہے۔ ماوی حکایت و روایت میں بہت گہری ڈوبی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں ایک مچھیرے دیوتا نے مچھلیاں پکڑتے پکڑتے اپنے جال میں اس جزیرے کو پھانس کر سمندر کی گود میں سے باہر نکالا۔ اسی دیوتا نے سورج کو نظر بند کر کے اس کی حرارت کم کی اور اس کی آگ چرا کر انسان کو تحفتاً لا کر دی۔

دنیا کا سب سے بڑا خفتہ جوالا اس جزیرے میں ہے۔ جوالا کا منہ اتنا بڑا ہے کہ اس کو ''سورج کا بسیرا'' کہتے ہیں۔ ان جزائر میں ''ماوی'' ایک محاورہ بن گیا ہے۔ اگر تعریف کو نقطۂ عروج تک پہنچانا ہو تو کہا جاتا ہے ''ماوی''

اس جزیرے کی شہرت کے دو راز ہیں۔ ایک تو جوالا کے منہ میں ایک خاص قسم کا پودا Silver Sword اُگتا ہے۔ جو پھول گوبھی کی طرح پھیلتا جاتا ہے اور اس کی شاخیں روپہلی تیروں کی طرح اوپر اٹھی ہوتی ہیں۔ یہ پودا دنیا میں اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ دوسرے اس جزیرے میں بہترین گھوڑے، بہترین کاؤبوائے، بہترین چوگان باز اور بہترین ٹماٹر ہوتے ہیں اور دنیا میں سب سے بڑی گنے کی فصل یہاں اگتی ہے۔

کووائی (Kauvi)...... کو فردوس ثانی کہا جاتا ہے۔ یہ سبز ترین جزیرہ ہے۔ اس کی ایک کوہستانی کلغی دنیا کی سب سے زیادہ گیلی زمین ہے۔ کہاوت ہے کہ اس جزیرے کی بنا بھی جل پریوں نے ڈالی تھی۔ ان شبستانی شہریوں نے راتوں رات جزیرے

KitaabPoint.blogspot.com

کے آبشار اور وادیاں بنائیں اور خود اپنے ڈیرے ڈال دیئے۔ سنا ہے یہ جل پریاں صرف شکرقند اور ناریل کے ملیدے پر زندہ تھیں۔ کچھ باشندوں کا عقیدہ ہے کہ اب تک یہ پودنی پریاں ''کووائی'' کے جنگلوں میں چھپی ہوئی ہیں اور چاندنی رات میں ہولا ناچنے باہر آتی ہیں۔

اس کی ایک جگہ نا قابل فراموش ہے۔ وہ ہے ''فرن گروٹو'' یہ ایک خنک غار ہے جس کے دہانے پر ۸۰ فٹ سے یہ ''فرن'' دیوزاد گیسوؤں کی طرح لٹک رہے ہیں۔

''نی ای یاؤ'' (Niihau)...... یہ جزیرہ ابھی اٹھارہویں صدی میں مقیم ہے۔ یہ سب سے چھوٹا اور سب سے پراسرار جزیرہ ہے۔ اس میں کوئی سیاح نہیں جا سکتا اور اچھا بھی ہے ورنہ سیاح بیسویں صدی کے جراثیم بھی اپنے ساتھ لے جائے گا۔ یہ جزیرہ ہوائی کا قدیم کلچر اپنے پروں کے نیچے چھپائے بیٹھا ہے اور اس کی کسی کو ہوا بھی لگنے نہیں دیتا۔

اس کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ ہوائی کے مشہور بادشاہ ''کیمہا کیمہا' دی گریٹ'' نے اس جزیرے کو سکاٹ لینڈ کے ایک خاندان ''روبن سنز'' کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ جنہوں نے یہ عہد کر لیا کہ جدید تہذیب کا گزر ادھر سے نہیں ہونے دیں گے۔ اس لیے یہ جزیرہ باقی دنیا کے لیے بند ہے۔ کوئی ہوائی جہاز نہیں جا سکتا۔ کسی بڑے آبی جہاز کا راستہ نہیں۔ خود اس کے مالک کشتیوں میں آتے جاتے ہیں۔

یہاں پر دو سو اصیل نجیب الطرفین ہوائی خاندان ہیں جو کاشتکاری کرتے اور بھیڑ بکریاں چراتے ہیں۔ یہاں مراسلات اور اطلاعات کی گنجائش نہیں۔ نہ ڈاک خانہ نہ ہرکارے نہ سینما' نہ ریڈیو نہ ٹیلیفون' نہ پولیس' نہ سیاست دان' انسانی معاشرہ اس سے بڑی مہاکتی اور کیا چاہ سکتا ہے۔

یہ ہوائی شے کیا ہے؟ ہوائی میں پہنچ کر سب سے پہلے سیاح پوچھتا ہے کہ اصلی ہوائی کہاں ہے؟ کدھر ہیں وہ فطری باشندے اور گھاس کی گھگھریاں؟ مجھے تو صرف یہ جواب بن پڑے کہ گھاس کی چھینیاں تو کھا گئیں ''مشنریوں'' کی بکریاں۔ اور اصلی جزیرہ کھا گیا یہ معاشرہ۔ آج کا ہوائی اس طرح امریکنیت میں غلطاں ہے کہ امریکہ کا بس چلتا تو سمندر بھی ناک میں بولتا۔ اور درخت کا ''کروکٹ'' (Crewcut) ہوتا۔ ہوائی کا اصلی معاشرہ یا تو عجائب گھروں میں حنوط شدہ ہے یا سرِ راہ بازاروں میں تماشہ بن کر بکتا ہے۔ یا مورمن مذہب کے ''پولی نیزی مرکز'' میں ہر ہفتے ایک غمگین کا رنگین تازیہ بن کر جلوس کی صورت میں سیاحوں کے لیے نکلتا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

اگر کوئی مجھ سے کہے کہ صرف ایک لفظ میں ان جزائر کی صفت بیان کرو تو میں کہوں گی ملائم' ان کا آسمان ملائم' ان کا آفتاب ملائم' ان کی ہوائیں ملائم' ان کی موجیں ملائم' ان کے برگ و گیاہ ملائم۔ ایسے کچے کچے ہرے ہرے مرغزار کہ دل چاہتا ہے کھیرے ککڑی کی طرح سب کچر کچر کر چبا جاؤ۔

ان کے باشندے سے ملیح و ملائم' ان کی زبان نرم و شیریں' ان کے گیت' ان کے رقص' ہلکے پھلکے' ان کی ساری کائناتی اور معاشرتی فضا سہل لب' سہل قدم' ان جزائر میں اونچی آواز سے بولنے کو جی نہیں چاہتا کہ کہیں ان کی ہم آہنگی چیخ نہ جائے۔ کرخت لہجہ یا درشت الفاظ اس فضا میں انجان دہقان معلوم ہوں گے۔ یہ جزائر صرف مہر و محبت کے لیے تھے۔ ان کی خونین اور تیرہ بخت تاریخ سے قطع نظر یہ آبی سلطنت انسان کو انسانیت کے لیے دی گئی تھی۔

یہاں کوئی موسم کی بات ہی نہیں کرتا۔ کیونکہ ضرورت ہی نہیں۔ ہمارے پاس سردی میں سوں سوں اور گرمی میں ہائے ہائے۔ یہاں سرما گرما کی مقیاس حرارت میں صرف دو ڈگری کا فرق ہے۔ سارے سال فضا خوشگوار۔ سارے وقت ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوائیں۔ آتے جاتے خدا معلوم کہاں سے پھوار پڑ جاتی ہے۔ یہ پھوار چپ چپاتے دبے پاؤں کدھر سے آ گئی' کدھر گئی۔ دن میں چار پانچ دفعہ پڑتی ہے اور دھیمی دھیمی دھوپ میں بھی پڑتی رہتی ہے۔ یہ امتیاز مشکل ہو جاتا ہے کہ سورج کی کرنیں ہیں یا بادلوں کی تارکشی۔ اس لیے عوام اس پھوار کو "آبی دھوپ" کہتے ہیں۔

اس ملیح موسم میں اگر کسی کا مزاج برہم ہو تو یا تو وہ ازلی دیوانہ ہے یا عشق کا دیوالیہ۔

میرے لیے اس جزیرے کی سب سے بڑی خوبی اس کی آزادی تھی۔ ایک روحانی و ذہنی آزادی۔ اس گمنامی کی آزادی جسے پانے والا ہی جانتا ہے یہاں کوئی نہ بیگم جانے' نہ مادام' کسی کو آپ کے نام اور کام سے واسطہ نہیں۔ سب اپنی اپنی تفریح اپنی تفتیش میں مست۔ یہاں عمر کا تفرقہ مٹ جاتا ہے۔ ذات پات کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ یہاں بڈھے بھی جوان ہیں اور سیاحوں میں زیادہ تعداد ان کی ہوتی ہے جو ستر پار کر چکے ہیں۔ ایسی ایسی بڑی بوڑھیاں جو ہمارے یہاں طاق پر بٹھا دی جاتی ہیں کہ تسبیح پھیریں اور قبر کا انتظار کریں۔ وہاں "بکنی" پوشاک پہن کر ساحلوں پر پہنچی ہوتی ہیں۔ عام بازار میں سڑکوں پر لوگ ننگے پیر' نیم برہنہ پھرتے ہیں۔ حد ہے کہ بعض طلباء موجوں میں نہاتے نہاتے اسی لباس میں اٹھ کر کالج یونیورسٹی کی جماعتوں میں حاضری لگانے چلے جاتے ہیں۔ پروفیسر شاید پہلی دفعہ کھنکارا یا عینک کے پیچھے سے گھورا ہو گا۔ اب وہ عادی ہو گیا ہے۔ کچھ اس فضا میں ڈھیل ہے۔ کوئی واعظ نہیں۔ کوئی ناصح نہیں۔ ہر ایک کے اعمال اس کے ساتھ' جیو اور جینے دو۔

KitaabPoint.blogspot.com

مجھے تو سب سے زیادہ مزا طلباء کی کاریں دیکھنے میں آتا تھا۔ وہ پرانی سیکنڈ ہینڈ موٹروں کے مرگھٹ سے پرانے مردے دوبارہ زندہ کرلاتے تھے کہ ہنس ہنس کر انسان لوٹ جائے۔ جس ملک میں ہمارے ٹوٹے پیروں کی ٹکر پر نوکزی موٹریں ہوں اور وہ بھی نئی سے نئی چمکتی دمکتی' وہاں یہ کھڑتوس کھٹارے جن کی دور سے دھک دھک سن کر بچے پرے ہٹ جاتے تھے۔ ایک عجب پر لطف مظاہرہ ہوتا تھا۔ ہمارے میاں نے بھی ایک پرانی فورڈ ایک ہزار میں خریدی۔ میں اس غریب کی غیبت ہرگز نہیں کروں گی۔ کیونکہ اس نے ایک دن دغا نہیں دیا۔ آٹھ مہینے دن رات پھرائی گئی۔ پندرہ پندرہ سواریاں بھر بھر کر ہر ساحل ہر پہاڑی پر لے گئی۔ صرف اس میں یہ سقم تھا کہ جب رکتی تھی تو اس طرح آواز آتی تھی۔ گویا کوئی ہوائی جہاز پٹڑی سے اتر کر بھک گیا ہو۔ اس کو بند بھی کر دو تو دیر تک بڑبڑاتی رہتی تھی۔ ہم نے نو مہینے میں اسے ایک دن صاف نہیں کیا۔ وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ پھر بھی چلتے وقت اسی قیمت پر بِکی جس پر خریدی تھی۔ مرحومہ بڑی وضع دار تھی۔

انسان یہاں اپنی عمر بھول جاتا ہے۔ سارے وقت جواں سال طبقہ کھیل تفریح کے نئے نئے ڈھنگ نکالتا رہتا ہے اور ہر کھیل کے لیے نئے نئے لباس تراشتا ہے۔ پیراکی کے لیے تو لباس کا نام لینا ہی غلط ہوگا۔ لڑکے نہ معلوم سی لنگوٹی یا چڈی اور لڑکیاں دو کترنیں محض تکلفاً پہنتی تھیں!! وہاں کئی اصطبل کرائے پر چلتے ہیں اور جب سیاح سمندری سیروں پر نکل جاتے ہیں تو امیر لوگ تو موزوں لباس پہنتے تھے لیکن طلباء وہی پیوندلگی جینز (Jeans)۔

ان طلباء کی جیبیں اکثر خالی ہوتی ہیں۔ اس لیے گھوڑے کا کرایہ بھی مانگ کر پورا کرتے تھے۔ کبھی امداد باہمی کے اصول پر دو گھنٹے کو ایک گھوڑا لیتے اور باری باری سواری کرتے اس کے جنگلوں میں پھول اور نئی نباتات ڈھونڈنا' پہاڑیوں پر سانس پھلانے والی چڑھائیاں کرنا۔ ہوٹلوں کے تالابوں میں آبی رقص کرنا۔ (Water Ballet) شام ڈھلے تک ماہی گیر کرنا۔ لیکن جب ان سب چیزوں سے بیزار ہوئے تو گرم خون نے ایک نئی تفریح اختراع کی وہ ہے کیچڑ پر سے پھسلنا (Mud Sliding) کسی پہاڑی کی نرم مگر گہری ڈھلان ڈھونڈلی اور اس پر چکنی مٹی کا پلستر کر دیا تاکہ جسم پر خراشیں نہ آئیں اور نیچے پانی کا ننھا سا تالاب بنالیا۔ اب باری باری اوپر سے پھسلنا شروع کیا۔ جب تک نیچے پہنچے کیچڑ میں لت پت اور گدلے پانی کی ڈبکی میں اور مٹیالے بھوت بن گئے۔ کیا عمر ہے! چوٹیں لگیں' نیل پڑے' پھر بھی ہنس رہے ہیں اور تماشائی ان سے زیادہ لوٹ پوٹ!

پھٹے حال ہونا ہر غریب ملک میں ایک معیوب مجبوری ہے لیکن امریکہ میں ایک ہردلعزیز فیشن ہے۔ اچھے بھلے طلباء اپنے نئے لباس کو جگہ جگہ سے پھاڑ کر پیوند لگائیں گے۔ قدیم سے قدیم تر کار چلائیں گے۔ جتنی فالتو شے ہو۔ اتنے پیار سے ڈرائنگ روم میں

KitaabPoint.blogspot.com

سجائیں گے۔ یہ بھی بھرے پیٹوں کے چونچلے ہیں اور امریکہ کے تو کہنے ہی کیا ہیں۔ خدا نے سو سال سے فیض کے دریا بہا دیئے ہیں۔ ان کو اتنا دیا کہ یہ "دینے والے" کو بھول بیٹھے۔ جتنا کھانا ان کے ہوٹلوں میں ضائع ہوتا ہے۔ جتنا کھانا یہ پالتو جانوروں کو کھلا دیتے ہیں۔ اس سے ایشیا کے غریب پل سکتے ہیں لیکن اللہ سے کون سوال کرے کہ امریکی کتے بلی کو ہندوستان یا کوریا کے کسان سے کیوں زیادہ خوش نصیب بنایا؟ علم اور معلم کے لیے ہمارے معاشرے نے جو جگہ رکھی ہے۔ اس لحاظ سے پالتو جانوروں کے بعد ایک دم پروفیسر صاحبان کا خیال آیا (میں نے خود تیرہ سال یہ اعزاز حاصل کیا ہے) کہاں ہمارے ملک کے دریدہ حال سہمے ہوئے بوکھلائے ہوئے استاد جو دونوں ہاتھوں سے کبھی اپنی عزت سنبھالتے ہیں اور کبھی اپنی سائیکل۔ کہاں امریکہ کے پروفیسر جو ہفتے میں ایک لیکچر دے کر دو ہزار ڈالر کما لیتے ہیں اور پھر بھی "کام زیادہ تنخواہ کم" کا واویلا مچاتے ہیں۔ خیر ہوائی میں پروفیسروں کے گھر دیکھے۔ گھر کیا حسن سے بھرپور عیش کدے ہیں۔ ہوائی کی پھیلی ہوئی سبز گھنی پہاڑیوں میں دور دور جہاں کار بھی مشکل سے جائے۔ ان کے خانگی خواب آویزاں ہیں۔ ان ننھے ننھے شیش محلوں میں بیٹھ کر آپ ایک طرف بحرالکاہل کے آبی رنگ اور رفتار سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ دوسری طرف ہوائی کا دوسرا رخ۔ اس کے بدمست مگر شائستہ شجرستان جہاں سانپ نہیں لیکن سانپ کی چھتریاں اگتی ہیں۔ جہاں کے پھول پتے توڑنے کو دل نہیں چاہتا کہ خود رو کائنات کا کوئی متبرک اصول نہ ٹوٹ جائے۔

شام ڈھلے عشائیہ پر یہ پر مذاق نفیس پروفیسر مشعلیں روشن کرتے ہیں۔ لیکن ان کو دیکھنے کا کس کے پاس وقت ہوتا ہے؟ نیچے وادی میں برقی قمقموں کے کارواں! جنگل میں لاکھوں جگنوؤں کے جشن اور اوپر آسمان پر بن بادل ستاروں کی بجلیاں کوندرہی ہوتی ہیں۔

بیٹھے بیٹھے اللہ میاں سے لڑ پڑی۔ لڑنے میں بہت طاق ہوں لیکن صرف اللہ میاں سے (انسان سے کیا لڑنا' کمزور پر زور آزمانا کہاں کی بہادری ہے) داور! اس خطے کو سب ہی کچھ دے ڈالا۔ ہمارے لیے کچھ تو چھوڑا ہوتا۔

پروفیسر نے صرف ہوائی کے بہت دلچسپ اور متواضع تھے بلکہ "اندرون" (Main Land) کے بھی کئی پروفیسر آئے ہوئے تھے۔ جن سے بات کر کے ذہنی افق فراخی پاتے تھے۔ ہوائی کے نیم چینی "ڈاکٹر لی" ایک سیاسی شرارہ تھے۔ ان دنوں وہاں کی یونیورسٹی میں ویت نام پر چوبیس گھنٹے بلا توقف مباحثہ ہوا۔ اس میں یہ پیش پیش تھے اور امریکہ کو کراری کراری' کھلی کھلی گالیاں دے رہے تھے۔ دو یہودی ڈاکٹروں (وہاں پر پروفیسر ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹری کا طب سے کوئی واسطہ نہیں) نے ہماری بہت خاطر کی۔ اپنے بیوی بچے موٹریں ہمارے حضور میں حاضری کے لیے وقف کر دیں۔ کچھ دیر کے لیے ہم فلسطین کے عربوں کو بھول گئے۔

KitaabPoint.blogspot.com

کیلیفورنیا یونیورسٹی کے معمر ستر سالہ سفید سر کے ڈاکٹر پال حنا جن کی کتابیں سوشیالوجی اور پبلک نظام میں نئی دریافت ہیں۔ بہت حلیم اور خندہ لب انسان تھے۔ ان کا گھر یہاں تو جو تھا سو تھا' بعد میں کیلیفورنیا میں دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ یہ سب پروفیسران امریکہ کی نسلی کھچڑی کی ایک مزید مثال تھے۔ آدھے جرمن' تین چوتھائی لبانی' ایک تہائی برطانوی' ۲۰ فیصد ہسپانوی' ۱۴ فیصد ڈچ' غرضیکہ ان بنوں بتوں میں علم بٹا ہوا تھا۔ فی الحال تو یہ سب امریکن تھے۔ ان میں زیادہ تر روشن خیال لبرل تھے۔ افسوس کہ ان کی مفلوج اقلیت امریکہ میں کوئی زبان کوئی آواز نہیں رکھتی۔ ان کے پاس ایک بھی اپنا روزنامہ اخبار نہیں۔ ایک ''لبرل'' ٹیلیویژن یا ریڈیو کی ''چینل'' نہیں۔ وہ اکثر مجھے بتاتے تھے کہ ہم خود اپنے ناخن چباتے ہیں اور بال نوچتے ہیں لیکن ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ امریکہ کی خارجی پالیسی نہ صرف پوری قوم کی اخلاق خودکشی ہے بلکہ ساری دنیا کے لیے ایک ہیبت ناک خطرہ ہے۔ اگر ہم صرف اپنی تیل کمپنیوں اور سی آئی اے کو باہر نہ بھیجیں تو امن قائم رہ سکتا ہے۔ یہ ڈاکٹر سمتھ نے سرخ منہ سے کہا۔ ''کون سا انصاف! کون سی جمہوریت! ہم تو ایک فوجی آمریت ہیں۔'' ان درخشاں ذہنوں سے مل کر روحانی خوشی ہوتی ہے۔ کاش کہ امریکہ کی لیڈر شپ پر یونیورسٹیوں کا کوئی اثر ہوتا جب کنزاز (Kansas) کی یونیورسٹی نے ''ژاں پول سارتر'' کو لیکچر کے لیے مدعو کیا تو اس فرنچ مفکر نے آنے سے انکار کر دیا اور جواب دیا کہ ''تم اہل فکر امریکہ کا نامرد طبقہ ہو جن کا سیاسی وزن یا اخلاقی اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔''

ایک پروفیسر کا تعارف ذرا لمبا ہو جائے گا کیونکہ وہ خود سات فٹ ایک انچ کے تھے ایک دن میں یونیورسٹی لائبریری میں کتابیں لے رہی تھی تو ایک معتکف دیو قامت سر سے گنجے صاحب مجھے بغور دیکھ دیکھ کر مسکراتے رہے۔ مسکرانا ہوائی میں ایک فضائی عادت یا روحانی ورزش ہے۔ میں پھر خانہ پری کرنے لگی۔ کارڈ پر لائبریرین نے کچھ بحث چھیڑ دی تو میں ذرا جز بز ہوئی تو پنجابی آواز آئی ''بادشاؤ تسی کیوں اوکھے ہوندے او۔'' پلٹ کر دیکھا تو یہ بدہیبت بلندی میرے قریب کھڑی تھی۔ مجھے پھر بھی یقین نہیں آیا کہ اتنا ''ڈاہڈا سوہنا'' پنجابی لہجہ اس سفید ستون نے ادا کیا ہے۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ کچھ رسمی گفتگو ہوئی لیکن مجھے ان صاحب کی پوری رام کہانی گاہے بگاہے ملاقاتوں میں خود ان سے معلوم ہوئی۔ نام ''سوامی آ گیا نندن بھارتی'' تعارفی نام ڈاکٹر بھارتی' گوشت پوست ''وی اینا'' کا' پاسپورٹ امریکی۔ اس وقت امریکہ کی ''سراکیوز'' یونیورسٹی میں انتھروپولجی اور سوشیولجی پر ماہر مانے جاتے ہیں اور کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ اس مغربی علم دان کا سوامی ہونے سے کیا مطلب؟ جب یہ انیس سال کے تھے تو آسٹریا میں سبھاش چندر بوس اپنے سیاسی پرچارک اور فوجی مدد کے لیے آیا تو یہ اس کے Personal Adjutant ہو گئے اور اس کے ساتھ ساتھ رہے۔ جب سبھاش سورگباش ہوئے۔ (بیچارے کا ہوائی جہاز جاپان نے خفیہ طور پر تور پیڈو کر دیا تھا) تو پروفیسر بھارتی نے

KitaabPoint.blogspot.com

ہندوستان پر وردکیا اور اس کی شمالی جنوبی وسعتوں میں دس سال خاک چھانی۔ راما کرشن مشن میں بھرتی ہو کر چیلے بنے۔ سر منڈایا رات تپسیا کی۔ ہر گرو کی چلم بھری۔ ہر گرنتھ پڑھی۔ چار یورپی زبانیں پہلے سے آتی تھیں۔ ہندوستان کی چھ زبانیں اور سیکھ لیں (اس وقت ۱۵ زبانیں بخوبی بولتے ہیں) اور محض تکلفاً نہیں بلکہ عملاً ہندوستان کے تنوع اور معاشرے کو سمجھنے کے لیے بڑے شہروں سے گاؤں تک ہر مزدور کسان ہر عورت اور بچے سے گفتگو کی۔ اپنے ملک کے متعلق منہ کھولتے شرم آتی تھی۔ کم بخت ہر چیز جانتا تھا۔ ہر ذات کے شجرے۔ آم کی نسلی تاریخ۔ پان کی شاہانہ شاخیں۔ عورتوں کی ازدواجی شکایتیں۔ ''تمہارے ملک میں عورتوں کا حال تباہ ہے میں دیس دیس گاؤں گاؤں پھرا ہوں۔ عورت مجھ سے پہلی ہی ملاقات میں دل کے در دوا کر دیتی تھی۔ کیونکہ ایک تو میں زرد چولے میں گرو سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے فرنگی تھا اور غیر قوم کے سامنے عورت اپنی تکالیف بے حجاب کرنے میں عار نہیں سمجھتی۔ یقین مانئے مسٹر ریاض الدین آپ کی عورتوں کو ان کے خاوند جانوروں کی طرح برتتے ہیں۔ اپنے محدود تعلیم یافتہ امیر طبقے کو آپ ایک طرف رہنے دیں میں صرف جاہل شہریوں اور اس اکثریت کی بات کرتا ہوں جو دیہات کے اجڈ گنواروں پر مشتمل ہے' زیادہ تر عورتیں خاوندوں کی جنسی فرمائشوں کے ہاتھوں رو رہی ہیں۔ مرد صنف نازک کو جذباتی اور جسمانی طور پر آہستہ آہستہ تیار کرنا بالکل نہیں جانتے ان کو اگر انگریزی کی کتابیں نہیں پڑھائی گئیں تو کم سے کم ''کاما سوتر'' کا پنجابی یا سندھی میں ترجمہ کر کے دیا جاتا۔ آپ کے ملک اور ہندوستان میں بہت کم عورتیں ایسی ہیں جو جنسی تعلقات سے لطف اندوز ہوں۔'' میں چپ سنتی رہی۔ میں اپنے معاشرے پر باہر والوں کی نکتہ چینی سے کبھی بیچ پا نہیں ہوئی۔ حقیقت سے گریز کر کے تلملانا بہت مشکوک اور متروک قسم کی حب الوطنی ہے۔ جو پروفیسر بھارتی کہہ رہے تھے۔ زیادہ تر صحیح تھا۔ نشتر میڈیکل ہسپتال اور میو ہسپتال کی عورتوں کے ''وارڈ'' میں اکثر یہی دکھڑا سنا جاتا ہے۔ بہر حال پروفیسر بھارتی سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ ہمارے یہاں بن بلائے بھی آ جاتے تھے کیونکہ انہیں ہمارے پراٹھے اور چٹ پٹے کھانے بہت پسند تھے۔ باوجود سوامی ہونے کے وہ ہندوستان کو بہت کھری کھری سناتے تھے۔ ہندو طلباء نے ان کے اعزاز میں ایک خاص تقریب منعقد کی۔ بھارتی گرو تقریر کے لیے اٹھے شروع ہی کے دو منٹ میں آپ نے میزبانوں کو ٹھنڈا کر دیا' فرمایا۔ ''ہندو فلسفہ و حیات گول مول روئی کے گالے ہیں جنہیں مغربی مفکر گھر لے جا کر باریک باریک سوت میں کاتتے ہیں اور ٹیڑھے میڑھے جامے پہناتے ہیں۔'' آگے چل کر سوامی جی بولے۔ ''تمہاری سیاست معاشرے کی طرح منافقت سے اٹی پڑی ہے اور پنڈت نہرو تو دانشورانہ دھوکہ (Intellectual Fraud) تھا۔ ہندو طلباء نے اپنے پر لعنت بھیجی کہ ہم نے اس بلا کو دعو کیوں کیا۔

ڈاکٹر بھارتی آزاد خیال مفکر ہیں اور خاصے منہ پھٹ بھی۔ کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ خود شادی نہیں کی۔ برہمچاری ہیں لیکن

KitaabPoint.blogspot.com

اوروں کی شادیاں کرانے کا بہت شوق ہے۔ امریکہ میں جو ہندو شادی ہوتی ہے بلائے جاتے ہیں اور اپنا چولا پہن کر اگنی کے سامنے اشلوک پڑھتے ہیں اور دولہا دلہن کو پھیرے ڈلواتے ہیں۔ ہندوستان میں پھیرے کی رسم ایک نفسیاتی ضرورت ہے۔ غریب دولہا دلہن اتنے چکر کھاتے ہیں کہ ازدواجی زندگی کے چکروں کے عادی ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر بھارتی آرتھر کوسلر کے جانی دوست ہیں اور آج کل دونوں کسی لائبریری میں تارک الدنیا ہو کر بدھ مت کے تانترک پتھیوں پر دن رات تحقیق کر رہے ہیں۔

ہوائی میں دو ہوٹل بہت انوکھے تھے۔ میں اپنے ہر پاکستانی مہمان کو وہاں زیارت کے لیے لے جاتی تھی۔ ایک تھا ''الی کائی'' جس کی لفٹ مکمل گلاس کی تھی۔ جوں جوں اوپر جاتی سمندروں کیا فیروزی فروغ نظر آتا۔ دوسرا ہوٹل ''لا رونڈ'' (La Ronde) جس کی بالائی منزل سراسر شیشے کی بنی ہوئی تھی اور اپنی ''سپرنگوں'' پر آہستہ آہستہ گھومتی رہتی تھی۔ جس منظر سے آپ سیر شروع کریں۔ گھنٹہ بھر میں چکر کاٹ کر وہ آرام سے اسی جگہ آپ کو لے آتی تھی۔

ایک اور جگہ میری محبوب پناہ تھی۔ وہ پالی کی بلندیاں اس کی دو خصوصیات تھیں۔ ایک تو بلند ترین پہاڑوں میں بالکل سیدھی سپاٹ ڈھلان تھی جو کٹورہ سی وادی میں جا کر رکتی تھی دوسرے اس مقام پر ہوا اتنی تند ہوتی ہے کہ کاروں کے ''ہڈ'' بھی اڑ جاتے تھے۔ اس میں دھان پان اصحاب تو ہوا ہو جائیں۔ میں شاید ہمت نہ کرتی لیکن ہوائی میں کئی سیر وزن بڑھ چکا تھا۔ اس لیے خطرہ کم ہو گیا تھا۔ مجھے پہلے ہی سے آگاہی مل چکی تھی۔ کہ ساڑھی پہن کر مت جانا۔ پیٹی کوٹ بالکل چھتری کی طرح پھول کر سر پر چھا جائے گا۔ تو میں پہلی دفعہ ہوائی لباس ''مومو'' پہن کر گئی۔ لیکن بال کھلے ہوئے تھے۔ جونہی کار سے اتری۔ میرے بال ہوا میں سیدھے ناگ کی طرح کھڑے ہو گئے۔ میری بیٹیاں ہنس ہنس کر پاگل ہو گئیں۔ میں بالکل بدہیت کالی چنڈی ماتا لگ رہی ہوں گی۔ کئی سیاح اپنے کیمرے مجھ پر جمانے لگے۔ انھوں نے ہندوستان کا مشہور ''رسی کا شعبدہ'' (Rope Trick) سنا تھا۔ لیکن یہاں ایک ساڑھی والی اپنے بالوں کو ہوا میں الٹا معلق کیے ہوئے تھی۔ یہ بھی کوئی شعبدہ تھا۔ میں بھاگی لیکن بھاگوں کہاں؟ ہوا کا زور پیچھے پھینکتا ہے۔ بچے مرد اپنے سروں پر وزن رکھ کر جانا چاہتے ہیں لیکن پھر بھی اس خاص رخ پر ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے۔ یہ تماشا سارے وقت چلتا ہے اور دیکھنے میں مزا آتا ہے۔

جزیرہ ہوائی والے صرف تفریح جانتے ہیں' خوف نہیں۔ لیکن ایک چیز کبھی کبھی ان کو دہلاتی ہے وہ ہے دیوزاد موج جو شاذ و نادر بہت خاکساری سے دو سو میل دور رواں ہوتی ہے۔ راستے میں اپنی آغوش میں طوفانوں کی لپیٹتی ہوئی چالیس پچاس فٹ تک بلند ہوتی

KitaabPoint.blogspot.com

ہے اور چھوٹے موٹے جزائر غرق کرتی ہوئی ہوائی کے سات بڑے جزائر کے ساحلوں حملہ آور ہوتی ہے۔ دس سال ہوئے اس نے کئی گھر غرقاب کر دیئے۔ البتہ جانی نقصان نہیں ہوا۔ کیونکہ امریکہ کا نظام بلکہ تمام مغرب کا طریق حکومت ایک بھی انسان کی جان کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ ایشیا میں تو انسان کتے بلیوں کی طرح مرتے رہتے ہیں۔ اخبار اکثر رپورٹ کرنا بھول جاتے ہیں۔ کیونکہ کالم میونسپل الیکشن اور کرکٹ میچ سے بھرا ہوتا ہے۔ لیکن امریکہ انگلستان میں ایک سڑک پر ایک پلا بھی مرجائے تو تین دن تک اخبار تفتیش کرتے رہتے ہیں۔ خیر مجھے بڑا ارمان تھا کہ میرے سامنے یہ موج اٹھے۔ کچھ خوف بھی آتا تھا کہ اگر سچ مچ اٹھ کھڑی ہوئی اور بجائے پچاس فٹ کے ستر فٹ چڑھ گئی تو ہم کہاں جائیں گے۔ آخر بحر الکاہل تو مشہور من موجی ہے جو موج میں ایا کیا۔ لیکن دل میں کرید بھی تھی کہ اسے دیکھوں۔ بہر حال چلنے سے دو ہفتے پہلے زور کا سائرن بجا۔ ہم نے سوچا کہ جھوٹا الارم ہوگا۔ پھر بجا تو سوچا کہ فضائی ورزشیں ہو رہی ہیں۔ پھر ٹیلیفون بجا۔ ایک پروفیسر نے بہت آرام سے ہنس کر کہا کہ آپ "وائی کیکی" ساحل چھوڑ کر اونچے مقام پر آجائیے۔ ایک خطرناک موج اٹھ رہی ہے۔ ریڈیو پر اعلان ہو رہا ہے۔ ہم نے شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔ دل دھڑ دھڑ لیکن کچھ خوشی بھی کہ تمنا پوری ہوئی۔ ریاض صاحب کو دفتر فون کیا کہ جلد گھر آؤ۔ میرے میاں کا اطمینان اس قدر نورانی قسم کا ہے کہ امید تھی کہ موج کے بعد گھر پہنچیں گے۔ اتنے میں ٹیلیویژن چلا دیا۔ شہر کے پسماندہ علاقوں میں خاصا اضطراب تھا۔ لوگ گھر خالی کر رہے تھے۔ قیمتی چیزیں اٹھا اٹھا کر کاروں میں روانہ ہو رہے تھے۔ پولیس اور ملٹری نے بہتر سے ساحلوں پر قبضہ کر لیا۔ بعض سڑکوں پر سناٹا' لوگ بہت جلد بھاگ گئے۔ ہر پانچ منٹ میں موج کا تازہ ترین حلیہ بیان کیا جاتا تھا۔ اب اتنی اونچی اتنی چوڑی اتنی تیز ہو گئی ہے۔ ہمارے پاس کوئی قیمتی چیز نہیں تھی۔ سوائے پاسپورٹ اور چیک بک کے وہ ہم نے اپنے بٹوے میں ڈال لیں۔ ہماری بیٹیاں ہم سے زیادہ خوش خیر جھومتے جھامتے میاں بھی پہنچ گئے۔ وہ بچوں سے بھی زیادہ کھیل رہے تھے۔ ہم بس کار میں بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔ "سارا علاقہ خالی ہو گیا ہے' جلدی کسی پروفیسر کے پہاڑی گھر میں پناہ لے لو۔"

میاں بولے۔ "واہ جلدی کیا ہے! ذرا شہر کی گہما گہمی تو دیکھیں کہ لوگ کس طرح ڈرے ہوئے بھاگ رہے ہیں۔"

پھر سائرن بجنے لگے۔ اعلان ہوا کہ یہ آخری آگاہی ہے۔ اس کے بعد ہم لوگوں کے ذمہ دار نہیں لیکن میاں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انہوں نے کار کا رخ سب سے پر خطر علاقے کی طرف کیا۔ جب منجھ بازار پہنچے تو ملٹری پولیس نے وہ ڈانٹ پلائی کہ فوراً مراجعت فرمائی اور ہوائی کے سب سے بڑے اور خوبصورت ہسپتال میں آ کر رکے۔ ایک دم میاں بیوی کو یاد آ گیا کہ آج تو ہم دونوں کی تین بجے ڈاکٹر سے ملاقات ہونی ہے۔ چلو ایک پنتھ دو کاج۔ مریض کھڑکیوں کے پاس بیٹھے موج کا انتظار کر رہا تھے کیونکہ یہ ہسپتال دس

KitaabPoint.blogspot.com

منزلہ تھا۔اس لیے کوئی ڈر نہیں تھا۔ڈاکٹروں نے ہم دونوں کو اطمینان سے دیکھا۔رسمی مذاق کیے۔ہم باہر آ گئے تو اعلان ہوا کہ اس مہیب موج نے آدھے راستے میں دم توڑ دیا۔لوگ گھروں کو واپس جائیں۔ایک عظیم ڈرامے کا ''اینٹی کلاس میکس (Anti Climax) یہ ہوتا ہے۔سخت کوفت ہوئی۔کھسیانے ناامید گھر واپس آئے۔اپنے پاسپورٹ چیک بک پھر دراز میں رکھے' میاں بستر پر دراز اور بچے شام کی پکنک کی تیاری کے لیے میری خوشامد کرنے لگے کہ دہی بڑے بناؤں۔اور مجھے اس بات کا غم اور غصہ کہ یہ موج کہاں مر رہی۔ایک دفعہ تو نامراد کو اٹھتے دیکھتی۔

حال ہی میں ایک جگہ مجھ سے فرمائش ہوئی کہ ہوائی کے لباس کے متعلق بتاؤں۔تو صاحب ہوائی کا ''ازلی لباس'' تو تھا ننگی جلد' آہستہ آہستہ عورتوں پر جب حیا غالب آئی تو انہوں نے گھاس کی گھگھریاں کمر پر لٹکا لیں اور سینے پر پھولوں کے ہار ڈال لیے۔جب عیسائی مبلغ امریکہ سے آئے تو ان کی شائستہ خواتین یہ برہنگی دیکھ کر بہت برہم ہوئے اور پچکار پچکار کر ان آزاد ہرنیوں کو معاشرت کے لبادوں میں دھکیلنے لگیں۔یہ لباس بغیر کسی کاٹ کے ایک چولا ہوتا تھا Mother Hubbard' اس چولے نے بتدریج ترقی پائی۔کہیں پھندنا لگا۔کہیں پٹی' کہیں آستین کہیں چنٹ' کہیں کاٹ' لیکن پھر بھی آج چولا کا چولا ہے۔اور صرف سیاحوں کی خوشی کے لیے ہزاروں کی تعداد میں بکتا ہے اور ''مومو'' کہلاتا ہے۔مرد اس لباس کو اس لیے پسند نہیں کرتے کہ اس میں جنسیت عنقا ہے۔عورت کا جسم بہت کم نظر آتا ہے۔ایک لحاظ سے یہ ہمارے لیے شرعی لباس ہوسکتا ہے۔عورتوں کو اس لیے پسند ہے کہ اول تو حسین رنگوں میں ملتا ہے۔دوسرے اس کے نیچے نہ جانگیے کی ضرورت نہ پیٹی کوٹ کی۔صبح سے رات تک پہنے رہو۔اسی میں سو جاؤ' اسی میں رقص کر لو۔ہوائی میں یہ لباس ہر جگہ چلتا ہے۔اس پر بال کھلے ہوں تو سونے پر سہاگہ۔اس لیے لڑکیاں اس مومو کی خاطر بال بھی لمبے کر لیتے ہیں یا مصنوعی چٹیاں لگا لیتی ہیں۔اب یہ مومو ساری دنیا میں ہر دلعزیز ہوتا جا رہا ہے۔حد ہے کہ اب کراچی میں بھی بکنے لگا ہے۔میں بھی ایک عدد مومو لائی ہوں اور جب ہوائی کی یاد ستاتی ہے اس کو پہن لیتی ہوں۔یہ پہلا مغربی لباس ہے جس پر میاں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی۔

لیکن وقت کی ستم ظریفی پر ہنسی آتی ہے جن عیسائیوں نے برہنگی پر واویلا کیا تھا اور یہ چولا ایجاد کیا تھا۔انہی عیسائیوں کی موجودہ نسل تقریباً برہنہ ''ٹوپیس'' اور ''ٹوپ لیس'' میں ساحلوں پر لیٹی ہوئی ہے۔گھاس کی گھگھریاں تو کم سے کم گھٹنوں تک آتی تھیں۔اب تو جسم کا کوئی حصہ پوشیدہ نہیں۔بکنی (Bikini) تو محض ایک قانون اور معاشرے کے لیے دھوکا ہے۔اس کا بھی کیا ضرورت ہے۔

ہوائی کا قصہ نامکمل رہ جائے گا۔جب تک اس پھل اور پھول کا ذکر نہ کیا جائے۔ہوائی میں ہر وہ پھول اگتا ہے یا اگ سکتا ہے جو

KitaabPoint.blogspot.com

ہمارے یہاں اگتا ہے۔ اس کے علاوہ مغربی ممالک کے بیشتر پھول بھی وہاں اگائے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وادیاں نیم گرم اور پہاڑیاں نیم سرد اس لیے سارے سال دنیا جہان کے پھول لے لیجیے۔ لمبی تفصیل بے معنی ہے مجھے تو جن سے خصوصی عشق تھا' وہ یہ تھے۔ اپنی طرف کی چنبیلی اور موتیا دیکھ کر دل خوش ہوا۔ اس کو ہوائی میں ''پکا کی'' (Pikaki) کہتے ہیں۔ اس کا عطر بھی اسی کے نام سے خوب بکتا ہے۔ ان پھولوں میں مہک بھی تھی۔ ورنہ مغرب کے پھولوں میں حسن ہے' خوشبو نہیں۔ جگہ جگہ باڑین کی باڑیں'' کا منی'' کی لگی ہوئی تھیں۔ وہ شام سے اسی طرح پھولتی تھی کہ سر کو چڑھ جاتی تھی۔

مہندی کی بھی کئی کئی باڑیں تھیں جن کی عروسی خوشبو سے ہوا بھاری ہو گئی تھی۔ عورتیں جو ہی' ہار سنگھار اور گل شبو کے دو دو گز لمبے سانس گلے میں ڈالے چہل قدمی پر نکلتی تھیں اور قریب سے نکل جاتیں تو لمبے لمبے سانس لینے پڑتے تھے۔ ایک اور ظالم پھول ٹہٹی جزائر کا'' گارڈینیا'' تھا۔ اس کی صرف دو جھاڑیاں ہمارے سنٹر کے حسین باغ میں فضا پر چھا جاتی تھیں۔ اور گھنٹوں ان کی مہک سر میں سمائی رہتی تھی۔

لیکن ہوائی کے مخصوص پھول کچھ اور تھے سب سے سوشل پھول Plumeria سے ہمارے یہاں ''فران جاپانی'' کہتے ہیں۔ اس کے گجرے ہر تقریب میں پہنے جاتے تھے۔ گجرے میں نے دہلی لکھنو کے بھی دیکھے اور بمبئی کے بھی۔ لیکن ہوائی کے گجروں کا مقابلہ نہیں۔

یہ کم بخت امیر قوم کے پھول ائیر کنڈیشنڈ کمروں میں رہتے ہیں اور تازگی یہ کہ جب گجرے خریدو تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ڈالیوں پر سے ٹوٹ کر آئے ہیں۔ کوبرا سانپ کی طرح چار پانچ انچ موٹے اور گز بھر لمبے۔ اس جسامت کے ہار کبھی نہیں دیکھے۔ یہ سب پھولوں کی افراط کی بات ہے جو جزائر ساری دنیا کو پھول برآمد کریں ان کے گجرے اس ناپ کے ہی ہوں گے۔ کم بخت'' کارنیشن'' کے ہمارے یہاں دو چار گملے مشکل سے سال بھر کی محنت کے بعد پھولتے ہیں۔ وہاں اسی پھول کے موٹے موٹے ڈسنے والے گجرے ناگن کی طرح لہلہاتے تھے۔ صرف مجھے ان کی لونگ جیسی تیز بو پسند نہیں۔ ایک پھول پیپل کے پتے کی شکل بالکل عنابی ساٹن کا بنا ہوا ہے۔ چھو کر بھی دیکھو تو یہی معلوم ہوتا ہے' مصنوعی ہے۔ اس سرخ پتے پر زرد رنگ کا مکوڑا بیٹھا ہے جو اس کے نقش و نگار کا ایک حصہ ہے (یہ سچ مچ مکوڑا نہیں ہے) اسے ''اینٹ تھوریم'' کہتے ہیں اور یہ پھول ہفتوں نہیں مرجھاتا لیکن خاصا مہنگا ہے۔ پانچ روپے کے صرف دو ملتے ہیں۔ اس جزیرے کی اصلی جان'' فردوسی پرند'' جو جگہ جگہ اگ رہا ہے۔ یہ پھول سچ مچ بہشتی پرند کی طرح اس طرح ہوا میں معلق ہے کہ گویا ابھی پرواز کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے پر نیلے' پیٹ نارنجی اور چونچ ہری۔ دور دور اس کے جھنڈ اس طرح

KitaabPoint.blogspot.com

معلوم ہوتے ہیں جیسے فاختاؤں کے غول۔

اس کے علاوہ جاپان کا ''ازلیا'' بھی ہے اور جنوبی ایشیا کا ہر شگوفہ نظر آتا ہے۔ ہوائی کے پبلک باغات کے علاوہ پرائیویٹ باغات ہیں۔ یہاں پر خاص خاص سیاحوں کو مقررہ دن پر جانے کی اجازت ملتی ہے۔ انسان آب وگل کے کرشمے دیکھتا ہے اور صناع قدرت پر عاشق ہو جاتا ہے۔ ایک نئی چیز دیکھی وہ ''چوبی گلاب'' ہے۔ یہ کروندے کی بیلوں کی طرح دیوار یا درخت پر چڑھ جاتا ہے اور اس میں ہرے ہرے ڈوڈے لگتے ہیں۔ جب وہ چیخ کر پھوٹتے ہیں تو گلاب بن جاتے ہیں۔ پھر چند گھنٹوں کے اندر بالکل لکڑی کی طرح براؤن اور سخت ہو جاتے ہیں اور یہ چوبی گلاب ساری عمر نہیں مرجھاتے سیاح انہیں بھی سنبھال کر اپنے ملکوں میں لے جاتے ہیں۔ میں تو اس کے بیج بھی لائی تھی لیکن کم بخت اگے ہی نہیں۔

تھوہر (Cactus) کی اقسام سے مجھے شغف رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو میری ساس اس کی شوقین ہیں اور ایک دفعہ مجھے ان کی تیس انواع بطور تحفہ دی گئی تھیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ملک میں ان موسموں میں جب کوئی پھول سر نہیں اٹھاتا' یہی سخت جان گملوں میں سجے ساری کمی پوری کرتے ہیں۔ ایک دن میرے والد بولے۔ ''صاحبزادی! جہنم میں بھی یہی کھانے کو ملیں گے۔'' میں نے سوچا' چلو بہر حال ہی سہی۔ خیر تو تھوہر کی انواع بھی ہوائی میں خوب ہیں۔ ایک قسم لاطینی امریکہ سے اسمگل ہو کر آتی ہے۔ اس کو ''سیریس'' (Night Blooming Cereus) کہتے ہیں اور وہاں کے مشہور ''پوناہو'' اسکول میں اس کی باڑ لگی ہوئی ہے۔ اس پھول کی خصوصیت ہے کہ چاندنی رات میں کٹورے کی طرح کھلتا ہے اور صبح ہوتے ہی مرجھا جاتا ہے۔ کانٹوں میں اتنا نازک اور نفیس پھول کبھی نہیں دیکھا اور اس میں خفیف سی مہک بھی ہے۔ میں شام کو جا کر دو پھول چرا لائی اور اپنے ہال میں سجا دیئے۔ رات کو خیال آیا کہ صبح ہوتے ہی بیچارے مرجائیں گے۔ کیوں نہ ان کو سورج کی روشنی سے پردہ کرایا جائے۔ میں نے انہیں ''فرج'' میں رکھ دیا۔ سارا دن وہ مزے میں رہے اور سورج غروب ہونے پر پھر میں نے نکال کر سجا دیئے۔ اس طرح میں نے پانچ دن ان کو زندہ رکھا اور فطرت کو دھوکہ دیا۔ درختوں کی یہ کیفیت کہ چپے چپے پر کوئی نہ کوئی پھول دے رہا ہے۔ کھجور اور پام کی درجنوں انواع۔ سرو' چیڑھ' املتاس کے زرد فانوس پر روئے زمین آویزاں۔ گل مہر کے درخت سارے سال آتش فروغاں۔ پیپل (بودھی کا درخت) ناریل' کیلا' ایک درخت ''شاور'' (Shower Tree) کہلاتا ہے۔ تربوزی رنگ کے پھولوں سے لدا ہوا۔ پتے کم پھول زیادہ۔ اس کا چھتر اس طرح چھایا ہوا ہوتا ہے کہ دور دور تک سائے کی ضرورت نہیں۔ املی کے کمرخ کے درخت دیکھ کر دہلی کا قدسیہ باغ یاد آ گیا۔

KitaabPoint.blogspot.com

اب پھلوں کی سنئے! اچھا ذرا پہلے سبزی پر دو بول پڑھ لوں۔ بھنڈی چھ انچ کی' کریلے بلا مبالغہ دس دس انچ کے۔ ہمارے ملک کر ہر مسالہ یہاں بکتا ہے (صرف چاندی کے ورق نہیں ملتے)

ان کے قومی پھل تو اناس' پپیتا اور گنا ہیں۔ جس سے وہ پیسہ کماتے ہیں۔ اناس کے کھیت کے کھیت ہیں۔ اور کار روک کر آپ کسی ''بوتھ'' پر تازہ اناس مانگیے۔ اسی وقت چھیل کر مل جاتا ہے۔ چینی کی بھی ضرورت نہیں۔ پپیتے سائز میں چھوٹے' بیج ندارد اور نہایت رسیلے۔ پپیتوں کا یہ راز حکومت کسی کو بتانا نہیں چاہتی۔ باقی دنیا جہان کا پھل لے لیجئے' وہ پھیکا اور امریکہ کا محبوب پھل Avacado بھی ملتا ہے۔ جس پھل کی ہمیں خوشی ہوئی وہ آم تھا۔ ہمارے ملک میں آم پھلوں کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے لیکن ہوائی میں یہ ہر کوچے سے بے آبرو ہو کر نکالا جاتا ہے۔ اس غریب کی اتنی ذلت ہوتی ہے کہ شام کو بھنگی سڑکیں صاف کر کے آم گٹر میں ڈال دیتے ہیں اور درخت پھر بھی لدے کے لدے۔ وہاں یہ پھل کوئی نہیں کھاتا سوائے ہم جنگلیوں کے۔ لیکن آم میں اپنے دیس جیسی مٹھاس اور خوشبو نہیں۔ لیکن پھر بھی آم تھا' ہم نے خوب کھایا۔ یونیورسٹی میں دور دور آم کے درخت روشوں پر سایہ فگن تھے اور ہم نے ہمیشہ مفت کھائے لیکن یہی آم سپر مارکیٹ میں تین روپے سیر بکتا تھا۔ یہ عجیب بات تھی۔ غالباً سڑکوں پر مفت اٹھوانے اور دکان تک لا کر سجانے کی یہ قیمت تھی۔

لاہور سے ابا کا خط آیا کہ آم کا جشن ہو رہا ہے' تمہارے بغیر سرولی حلق میں پھنس رہے ہیں۔ ہم پڑھ کر بہت ہنسے۔

آم سے علی اکبر یاد آیا حالانکہ دونوں میں کوئی تعلق نہیں۔ ہمیشہ ریڈیو پر اس فنکار کا سرود سنا لیکن آمنا سامنا ہوا تو ''ہوائی'' میں۔ ان کے شاندار ''اوڈی ٹوریم'' اور یونیورسٹی میں کئی دن پہلے سے سب ٹکٹ ختم ہو گئے۔ اسی شام جب کرسیاں بھی بھر گئیں تو لوگ سامنے فرش پر بیٹھ گئے۔ پیچھے دروازوں میں ٹھٹھ کھڑے ہو گئے۔ ہمارے ملک میں جب مغربی موسیقی کا ماہر آتا ہے تو سامنے کی چار قطاریں پر کرنی مشکل ہو جاتی ہیں۔ خیر بدقسمتی سے علی اکبر کا ہوائی جہاز جو صبح آنا تھا' شام کو پہنچا۔ یقیناً ''پی او اے سی'' ہو گا اور غریب استاد ہوائی اڈے سے سیدھا محفل میں لایا گیا۔ نہ سرد موسم سے مانوس ہوا' نہ استاد کا مزاج۔ پہلا راگ چندرا نندن کچھ جچا نہیں۔ یہ علی اکبر کی اختراع ہے اور کئی راگوں کی کھچڑی۔ اور کھچڑی ہم کبھی نہیں چھوتے جب تک بیمار نہ ہوں۔ خیر طبلچی۔ گوپال اپنی جگہ بیٹھا تھا کہ تعارفیہ تقریر میں اس کا ذکر نہیں آیا۔ دوسرے راگ سندھی بھیرویں میں سے اس نے اپنے داؤ دکھانے شروع کئے اور اس قسم کی شعبدہ بازیاں کیں جس سے مغربی سامعین خوش ہوں۔ یہ موصوف علی اکبر پر چھا کر اپنی برتری دکھانا چاہتے تھے۔ لیکن استاد پھر استاد ہے۔ علی اکبر نے سندھی بھیرویں بجاتے بجاتے مغربی دھن (Green Leaves) کا ٹکڑا ملا دیا اور شری گوپال چکر

KitaabPoint.blogspot.com

میں آ گئے کہ یہ کون سا راگ ہے۔ ادھر سامعین پھڑک اٹھے۔ اپنے مانوس سروں پر تالیاں بجانے لگے۔ غریب گوپال بہت کچا ہوا اور کان کھجانے لگا۔ پھر ہم نے اگلے روز اطمینان سے چھوٹی سی محفل میں صبح تین بجے تک سرود کا سرور اٹھایا۔ استاد بھی مست تھا۔ سامنے ''وہسکی'' کا گلاس تھا۔ بجاتے بجاتے جب انگلی زخمی ہو گئی اور ذرا سا خون نکلا تو آپ نے وہسکی میں انگلی ڈبو کر پھر بجانا شروع کر دیا اور اسی جام کو چکھتے بھی رہے۔

آخر میں ہوائی کی ایک دلچسپ سیر گاہ کا اور ذکر کروں گا' پھر بس۔ وہ ہے ان کا ''پولی نیزی ثقافت کا مرکز'' (Polynesian Culture Center) یہ ادارہ مورمن چرچ چلا رہا ہے۔ مورمن بھی عیسائیت کے عجب پر اسرار باز ہیں۔ پچھلی صدی کے آخر میں ایک امریکی شخص پر ''وحی'' اتری کہ وہ مذہب کی اصلاح کرے۔ ایک نیا دین ''کتاب'' بغیر کسی طرح مکمل نہیں ہو سکتا تو غریب نے کتاب لکھی اور تبلیغ بھی کی۔ دیکھتے دیکھتے ہزاروں نے بیعت کر لی۔ آج مورمن چرچ بہت امیر اور وافر وسائل کا مالک ہے۔ اس کی شرع سے سگریٹ' شراب نوشی اور سود خوری منع ہے۔ سادگی پر زور ہے۔ رسومات کو نہیں مانتے۔ قبر پرستی سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کو ''امریکی وہابی'' کہا جا سکتا ہے۔ یہ پہلا مذہبی گروہ ہے جس کے ضمیر نے ملامت کی کہ ہوائی کے اصل باشندگان ''سفید بے اعتنائی اور بے رحمی'' کے باعث مٹ گئے ہیں۔ اس لیے کم سے کم ان کی روح کو ثواب پہنچایا جائے تو مورمنی گرجا نے لاکھوں ڈالر روپے کر زمین خریدی اور اس میں ''پولی نیزی'' بڈی بوٹی کی پانچ نمایاں قوموں کے چند بچے کھچے افراد مثلاً نیوزی لینڈ کے ''ماوری'' (Maoris) ٹونگا لینڈ کے ''ٹونگن'' (Tongans) فجی کے باشندے ''سموآ'' (Samoans) کے باسی اور ہوائن اپنے اصلی پس منظر یعنی گاؤں اور جھونپڑیوں میں آباد کئے۔ یہاں یہ باشندے اپنی دیرینہ دستکاریاں بناتے ہیں اور رقص و سرود سے آنے والوں کو محظوظ کرتے ہیں۔ یہ سارا علاقہ بہت خوشنما نہروں اور تختوں میں آباد ہے۔ داخل ہونے کا کوئی ٹکٹ نہیں' اگر کیمرہ آپ کی گردن میں ہے ورنہ ٹکٹ ایک ڈالر ہے۔ البتہ رات کو اگر رنگین روشنیوں میں وہی ناچ دیکھیں اور کھانا کھائیں تو ٹکٹ پندرہ ڈالر۔ ویسے تو یہ گاؤں معلومات و تفریحات کا مرکز تھا لیکن مجھے وہاں جا کر چنداں فرحت نہیں ہوئی پولی نیزی بھی کا مرمٹ گیا۔ اس کی ہڈیاں بھی پس گئیں۔ اب اس قسم کے جادو گھر میں اس کی روح کو واپس بلانا احترانہ تمسخر تھا۔ لیکن سیاحوں کو خدا سلامت رکھے۔ ان کے روپے سے مورمن گرجا کی جیبیں بھر رہی ہیں اور ان کی تبلیغ اور وسیع ہو رہی ہے۔

لیکن سارے مبلغ ایک طرف اور ہوائی کی گلگلوں وادیاں اور دوسری طرف مشنریوں سے زیادہ تو یہ کائناتی جمال انسان کو خدا کے قریب تر لایا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

یہ جزائر صنعت تضاد کا عجب مظاہرہ ہیں۔ آب و آتش کی باہمی بقا اگر نہ دیکھی ہو تو یہاں دیکھئے۔ ان کی کوکھ میں نیم جان جوالا اب بھی انگارے دہکا رہی ہے۔ ان کے سرہانے لازوال پانی افق کے دونوں کمانی کناروں سے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم! کہاں چرخ نیلمیں ختم ہوا اور کہاں یہ نیل شروع ہوا۔ یوں محسوس ہوا کہ گویا آب اور آسمان نے اپنی حدود کے ہتھیار ڈال کر ایک مشترکہ نظام حسن کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ خدائی وعدے کی پہلی جھلک ہے۔ باقی بالائی جنت فرشتوں کو مبارک، ہم تو اسی پر خوش تھے۔ واللہ اعلم پچھلے جنم میں کیا نیکیاں کی تھیں کہ قدرت نے یہ نیلگوں نروان ہمیں عطا کیا۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

لندن

لندن...... یہ کیا شے ہے! یہ پیچیدہ پراسرار سحر! یہ کالونی دھواں مارا' بارش زدہ نیم تاریک شہر۔ یہ مغربی معاشرت کا دھڑکتا ہوا دل۔ اس کے فنون کی آن وعصمت۔ اس لندن کو کن الفاظ میں بیان کروں؟ کن حاشیوں میں پابند کروں۔ اس کے ساتھ بچپن سے ہزاروں یادیں وابستہ ہیں۔ کس لندن کا ذکر کروں؟ تاریخی لندن کا جس کے پایہ سلطنت کو پیٹی کوٹ بہت راس آتا ہے خواہ ملکہ کنواری ہو یا بیوہ یا سہاگن...... اس کے سائے میں پھلتا پھولتا ہے۔ ہمیں اپنی تاریخ کم پڑھائی گئی اور برطانوی زیادہ۔ ہم پڑھ پڑھ کر خوش ہوتے تھے کہ الزبتھ کے سمندری کتوں نے ہسپانوی فلپ کی داڑھی کس طرح جلائی۔ لارڈ نیلسن ایک آنکھ کے باوجود قوم کا نور چشم کیسے بنا۔ تاریخ کے چکر میں پڑے تو باہر نہیں نکل سکتے۔ ادبی لندن میں گھسے تو وہیں بیٹھ جائیں گے۔ کس کس جن کا قصہ بیان کریں۔ ایک ایک کا سایہ ہم سب پر پڑ چکا ہے۔ اسی لندن کے ایک خم خانے میں "مارلو" کو چھرا جھونکا گیا۔ اس کے مرمیڈ تھیٹر میں شیکسپیئر نے جلدی جلدی اپنے شاہ پاروں کی آخری سطور گھسیٹیں "ایڈیسن" "ہیزلٹ" "لیمب" اور جونسن کا قہوہ خانہ۔ یہ ڈکنز تھیکرے' گالزوردی اور برنارڈ شو کی تخلیق کا مواد۔ برافروختہ نوجوانوں کا محرک! یہ لندن دنیا کے باغی اور زندہ ذہنوں کی جائے پناہ۔ یہاں کارل مارکس نے اپنا فلسفہ دیکھا۔ والٹیئر نے اپنے اشتعال انگیز چھپوائے۔

اس کی یونیورسٹیوں کی آزاد فضاؤں سے ہر ملک کے آتش نفس جوان' انسانیت مساوات اور انصاف کی آگ لے کر واپس گئے اور اپنے وطن میں جا کر خود برطانوی راج کے خلاف مشعل بن کر نکلے۔ یہ لندن غیر نوشتہ آئین کا علمبردار۔ یونان کے بعد دنیا کی سب سے پرانی شہری آزادی کی حمایت۔ موجودہ زمانے کی سب سے نیک نیت اور مسلسل جمہوریت!

تو صاحب کس لندن کی بات کریں؟ وہ جان بل یا کرنل بلمپ کا نشان۔ سامراجی عہد پر نازاں و درخشاں لندن۔ بین الاقوامی تجارت اور سیاست وضیافت کا مرکز۔ یا پچھلی جنگ عظیم کا بم زدہ "چرچل افروختہ" "نیم راشنی" لندن' یا اپنی راکھ سے دوبارہ زندہ لندن یا آج کا افراط زدہ لندن۔ بیٹ نک' موڈ راک ہپ کا گہوارہ! یورپ' امریکہ کے طرز فیشن کی پہلی چال! سستے ڈاکٹروں اور سستے سویٹروں کا بازار۔ اعلیٰ تھیٹر اور اعلیٰ کتب خانوں کا آخری معیار۔ آزاد صحافت اور شائستہ بی بی سی لندن! لیبر حکومت کے اصولوں کا نیلام لندن۔ قلم رکتا نہیں' جذبات تھمتے نہیں۔ اگر کبھی جلاوطن ہوئی تو بسوں گی لندن میں۔ ہاتھی مر کے بھی سوا لاکھ ٹکے کا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

برطانوی سورج غروب ہو گیا۔ سامراج سمٹ کر مشترکہ دولت بن گیا اور اس دولت میں بھی پھوٹ رہی ہے۔ ممالک رستے تڑا رہے ہیں۔ پھر بھی لندن انسان ہے' گرم جوش ہے' مہذب ہے' محفوظ ہے۔ نہ سہی نیو یارک کی بتیاں اور بلندیاں' نہ سہی پیرس' روم لینن گراڈ کی بجلیاں....... لیکن پھر بھی جب اس کے پارکوں میں گھومتے ہیں' جب اس کے ٹیکسی ڈرائیوروں' بس کنڈکٹروں سے واسطہ پڑتا ہے' جب اس کے کوکنی (Cockney) سے پیٹی کوٹ لین میں سودے چکاتے ہیں' جب اس کی آرٹ گیلریوں اور عجائب خانوں میں گھنٹوں قدامت سے متعارف ہوتے ہیں' اس کے پروفیسروں اور دانشوروں سے ہم کلام ہوتے ہیں تو ایک ایسا لطف آتا ہے جو اور کہیں نہیں۔ شاید زبان فہمی اس کی وجہ ہو لیکن امریکہ میں بھی تو انگریزی ہے۔

میری لندن سے ملاقات صرف تین چار بار ہوئی۔ پہلی دفعہ محض ایک سیاح کی حیثیت سے' دوسری طرف ایک مانوس شہری کی مانند اور آخری بار ایک عاشق دیرینہ کی طرح۔ پہلی دفعہ گیارہ سال ہوئے' لندن صرف آٹھ دن ٹھہری۔ وقت کم' پیسے کم' جنون تماشا وہ کہ کمرے میں تلوا نہ ٹکنے دے۔ اتفاق سے میرا تین چوتھائی سسرال بھی اسی زمانے میں کسی نہ کسی بہانے لندن آ ٹپکا۔ انیس افراد نے مل کر پوری منزل کے کمرے بک کر لیے۔ صبح ڈیڑھ سیر قیمہ مرچ ایک جٹھانی پکاتی اور رات کو مرغ شوربا دیورانی۔ مجھ سے یہ اصرار تھا کہ میں بھی اگر پیاز نہ کاٹ سکوں تو کم سے کم یہ دیگ ضرور چکھوں۔ میں نے کہا۔ ہزار لعنت سیاحت پر اور لندن پر' اگر میں چولہے کے پاس جاؤں۔ جب پانچ شلنگ میں مزے سے ریستوران میں کھا سکتے ہیں (وہ زمانہ بہت سستا تھا) تو میں کیوں چراندہ قیمہ ڈبل روٹی سے کھاؤں۔ میں نے تین دلچسپ ہم سفر تلاش کر کے کرائے پر موٹر لے لی اور لندن گائیڈ بک کے صفحے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہی جو سب دیکھتے ہیں۔ ٹاور آف لندن کا کوہ نور اور ہنری ہشتم کی جلادی کلہاڑی جس سے ہر چہیتی ملکہ کا سر اتارا جاتا تھا۔ غٹرغوں کرتا "ٹرافیل گر سکوائر" سینٹ پال گرجا جو سرراہ مصوروں کے لیے زیادہ مشہور ہے۔ غرضیکہ سمندری شہزادی کی ہر کروٹ' ہر انگڑائی دیکھ ڈالی۔ اب کیا کریں؟ تھیٹر؟ بدقسمتی سے شیکسپیئر کا گم نام اور لغوترین ڈرامہ "ٹائٹس اینڈ رونیکس" (Titus Andronicus) چل رہا تھا لیکن چونکہ لارنس آلیور اور ان کی مع لقا منکوحہ Vivien Leigh حصہ لے رہے تھے۔ ہم سوا پاؤنڈ فی کس خرچ کر کے پہنچ گئے۔

میری توبہ! شروع سے قتل و غارت' آہ و بکا' جرائم و مظالم۔ آخری سین میں سوائے لاشوں کے اور ہمارے کوئی ہال میں نہیں تھا۔ شوق ہو تو ایسا ہو۔ سب مجھ پر اور میرے "شیخ پیئر" پر لعن طعن کر رہے تھے اور مجھ سے پیسے واپس مانگ رہے تھے۔ اس سفر کا ایک لطیفہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ لندن سستے کپڑوں کے لیے مشہور ہے۔ ہم بازار میں سیر کر رہے تھے۔ ایک دکان کے شوکیس میں ایک

KitaabPoint.blogspot.com

عمدہ سوٹ لٹکا دکھائی دیا پرچی لگی ہوئی تھی "سوا پاؤنڈ" میرے میاں بیتابی سے میرا بازو پکڑ کر دکان میں جا گھسے جب سوٹ مانگا تو منیجر بولا۔ "یہ تو ڈرائی کلینرز کی دکان ہے۔"

دوسری بار ۱۹۶۰ء میں ریاض صاحب کو امپیریل ڈیفنس کالج کے کورس پر بھیجا گیا۔ میرے میاں صلح پسندی میں گاندھی صغیر کہلاتے ہیں۔ اس لیے ان کا دفاع جیسے موضوع سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ہماری سرکار کو اگر ذرا سا بھی شک ہو جائے کہ افسر اور کورس میں ہم آہنگی نہیں ہے تو وہ جبراً یا ضرورتاً اس کورس پر اسی افسر کو بھیج دیتی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ اس دنیا کی نعمتیں مجھ پر زبردستی عائد ہوئی ہیں' ہم جہاں گئے بہت مگن رہے۔ یہ پورا سال میری زندگی کا سب سے یادگار سال ہے۔ اس لندن کے عین دھڑکتے دل "ماربل آرچ" میں ایک فلیٹ لیا جس میں غل وغوغا غائب اور غسل خانے تین۔ مغرب میں اس سے بڑی جنت اور کیا مل سکتی ہے۔ پشت پر سارا ہائیڈ پارک۔ بائیں بازو میں "آکسفورڈ اسٹریٹ" جس کی دکانیں دیکھ دیکھ کر نیت بھر گئی۔

(اگر بیویوں کو فضول خرچی سے بچانا ہو تو ایسی جگہ ٹھہرائیں جہاں دکان بینی ہی سے تشفی ہو جائے) دائیں طرف وہ بدنام کونہ جہاں فرنگی طوائفیں راہ چلتوں کو شہ دیتی ہیں۔ شام کو میرے میاں مجھ سے دس قدم آگے چلتے تھے کہ موئی مورتیوں کو پتہ نہ چل جائے کہ وہ بقید نکاح ہیں اور پھر مجھے ان کے چٹپٹے جملے سناتے تھے۔

ہماری تینوں بچیاں جاتے ہی ریجنٹ پارک سکول میں داخل ہو گئیں۔ اس عرصہ میں ہم اس ملک کے تعلیمی نظام کے قائل ہو گئے۔ ہم ایک بوڑھا نوکر اپنے خرچ پر ساتھ لائے تھے۔ فرید ہمارا پرانا ملازم تھا اور ہر فن مولا۔ ڈرائیور' باورچی' بیرا' آیا (بچیوں کو اس نے پالا تھا) مالشیا (صاحب جب کرکٹ کا آدھا سینکڑہ بنا کر ریٹائرڈ کر دیے جاتے تھے تو بدن غرور سے اکڑ جاتا تھا) اس نوکر کو دنیا نظر لگاتی تھی' ترغیب دیتی تھی۔ ہمارے مکان کی مالکہ نے اسے ریڈیو بھی دیا لیکن اتنا وفا شعار کہ کسی قیمت پر ہم سے جدا نہ ہوا۔

میرے قیام کی کامیابی کا راز فرید بخش تھا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میں پاؤ لطف بھی نہ اٹھا سکتی۔ اس نیک بخت کو کوئی لت نہ تھی سوائے چائے اور سگریٹ کے۔ ہر جمعہ کی شام ہم اکثر دو دن کے لیے لندن کے اطراف کی سیر پر نکل جاتے۔ فرید بخش اپنے کمرے کی کھڑکی سے نہیں ہٹتا تھا۔ ہزار صلواتیں سنائیں کہ باہر جا کر تفریح کرو۔ "ارے نہیں بیگم صاحب! میں نے تو ساری دنیا دیکھ رکھی ہے۔ دونوں جنگیں یورپ کی لڑا ہوں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے' یہ لندن میرے لیے کیا شے ہے؟" فرید بخش کو باوجود دو جنگوں کے صرف تین لفظ انگریزی کے آتے تھے لیکن اسے کوئی نسلی یا لسانی احساس کمتری نہیں تھا۔ سینہ تان کر وہ ہر دکان میں گھس جاتا۔ شاباش ہے لندن کے سوداگروں کی جو اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے بھی کبھی اسے الو بنا کر بے ایمانی نہیں کرتے تھے۔

KitaabPoint.blogspot.com

فرید بخش Wool Worth کو گلبرگ کہتا تھا۔ ان دونوں ناموں میں کیا مشابہت تھی۔ آپ ہی کو معلوم ہوگا' یا اس بس کنڈکٹر کو جواسے گلبرگ اتار دیتا تھا۔ جب اس کا صاحب کہیں کار پیچھے موڑتا تھا جو فرید بخش بازو پھیلا کر سارا ٹریفک روک دیتا تھا۔ یہ اسی کا دم تھا کہ میری مہمانداری نبھائی۔ لندن میں سب خوبیاں ہیں لیکن یہ ایک زبردستی کی ہے کہ وہاں ہم وطن بہت نظر آتے ہیں اور نظر آنا بھی برا نہیں' وہ آن کر ٹھہر جاتے ہیں۔ میرے پہنچتے ہی تیسرے دن سے مہمان کمرہ جو بھرا تو کم ہی خالی ہوا۔ ہر محکمے داخلی' دفاعی کا چھوٹا افسر' سسرال میکے کا دوری قریبی عزیز' سہیلیاں' یار دوست...... کون ہے جو وہاں نہ آیا!

آخر میں ایک دوست بولے کہ اپنے گھر کے آگے بورڈ لگا دو کہ "ریاض کے پاس ٹھہرو اور لندن دیکھو۔"

اس کے علاوہ ڈیفنس کالج کے ۶۵ جوڑے تھے جو ایک دوسرے سے ملنے کے لیے کوشاں رہتے۔ ہفتے میں چار دن باہر کھاتے تو ساتویں خود دینا پڑتا۔ کالج کے انگریز جوڑے عموماً لندن سے باہر اپنے دیہی گھروں اور باغوں میں بلاتے تھے۔ لندن کی دخانی سڑکیں چھوڑ کر دس میل پار کرتے ہی اس کی دیہی گرد و نواح (Country Side) شروع ہو جاتے ہیں۔ جس کے لیے وہ مشہور ہے اور انگریزوں کو باغبانی سے عشق ہے۔ تھکے ہارے دفتروں سے آ کر بھی وہ باڑیں کاٹنا بونا شروع کر دیتے ہیں۔ باغبانی ایک صلح کل مشغلہ ہے۔ ازدواجی تنازعہ سے بچائے رکھتا ہے۔ بیوی کی ناک یا چٹیا کاٹنے سے بہتر ہے کہ باڑ کاٹتے رہو۔ اس سارے قیام کا ہیرو تو ڈیفنس کالج ہی تھا۔ اگر دنیا میں کوئی بہترین کورس ہے تو آئی ڈی سی افسوس کہ یہ دوبارہ نہیں ملتا۔ یورپ کے بہترین دماغوں' انگلستان کے مشہور لیڈروں' پروفیسروں' صحافیوں کو باری باری تقاریر اور مباحثے کے لیے مدعو کرتے ہیں۔ ہر بدھ کو چائے پارٹی پر بیوی بھی بلائی جاتی ہیں اور پھر چنے چنے فلم دکھائے جاتے ہیں۔ مہینہ میں ایک کاک ٹیل' ڈنر اور ڈانس بھی ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ امریکہ اور دولت مشترکہ کے دلچسپ لوگوں سے مل کر ذہنی فراخی ملتی ہے۔

اس کالج میں کوئی امتحان نہیں کوئی پابندی نہیں۔ صرف ذہنی ضیافت ملتی ہے' کبھی کبھی میرے میاں ہفتے اتوار کو ملا کر پیرس یا پرتگال کھسک جاتے تھے اور بہانے بھی ان کو قدرت کی طرف سے ملے ہوئے تھے' کبھی آئی سی اے کی' کبھی ایکشن اولمپنگ کمیٹی کی میٹنگ۔

تین مہینے کے اندر میرے میاں کو اپنا ملک یاد آنے لگا۔ فرمایا "یہ کالج تو محض علمی عیاشی ہے۔ اپنے ملک کے اتنے لاینحل مسئلے پڑے ہیں کہ وہیں جا کر کام کرنا چاہیے۔" یہ سارا سال میرے لیے نیک شگون تھا لیکن ریاض صاحب کے لیے ایک سرکاری لطیفہ۔ قصہ یہ کہ ان کو لندن بھیجا گیا کہ ڈیفنس کالج میں جا کر سیکھو اور واپس آ کر کراچی میں اسی طرز کا کالج ترتیب دو۔ چھ مہینے بعد حکم صادر

KitaabPoint.blogspot.com

ہوا کہ ڈینفس کالج التوا میں پڑ گیا ہے۔ اب گرمی کی چھٹیوں میں تم امریکہ جا کر پبلک نظام سیکھو تا کہ واپسی پر لاہور میں سٹاف کالج چلا سکو۔ جب یہ امریکہ سے ہر یونیورسٹی کا پانی پی کر واپس آئے تو تیسرا اعلان کاغذی شائع ہوا کہ تم کو کمشنر امداد باہمی تعین کیا جاتا ہے۔ ان دفتری داستانوں کو درج کرنے کے لیے ایک بیربل کی ضرورت کیونکہ وہی بذلہ سنج بتا سکے گا کہ سرکاری حکام میں منطق اور مزاح کی کیا آمیزش ہے۔

ہمارے فلیٹ کی مالکن "رما" ایک قابل ہنرمند بنگالن تھی جس نے بالشری پاس کر لی تھی۔ اس کا پنجابی میاں ایک سیلانی تاجر تھا جو دنیا بھر میں گھومتا تھا اور شاذ و نادر گھر آتا تھا۔ رما دل کی اچھی اور دماغ کی اس سے بھی اچھی تھی۔ جب کبھی بنگالی ڈش پکاتی تو ہم کو ضرور کھلاتی۔ ان کے یہاں افریقہ اور ایشیا کے طلباء اکثر جمع رہتے۔ جن سے مل کر خوشی ہوتی اور معلومات بڑھتیں۔ رات کو ڈنر کے بعد جب کبھی مغربی رقص کی محفل جمتی تو ہم کو گھسیٹ کر لے جاتی۔ اس کی چھوٹی تین سالہ بیٹی "گوری" بہت مزے کی زبان انگریزی میں ملا کر بولتی تھی۔ میں ایک دن قلم پکڑے اپنے صوفے پر بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ جناب گھسیں اور بولیں۔ "کیا تمہیں لکھنا نہیں آتا میں لکھ دوں۔" ایک دن منہ سجائے آن دھمکیں۔ "میری ماں اپنے آپ کو دنیا کا بہترین کوکر سمجھتی ہے' مار مار کر اپنے ہاتھ کا بدمزہ کھانا مجھے کھلاتی ہے۔" رما نے ایک لٹے ہوئے مہاراجہ موروی سے "برکھرسٹ پیلس" سستے داموں لے لیا۔ کچھ سال بعد اس کی قیمت دس گنا ہو گئی۔ ہمارے سامنے شہزادی مارگریٹ نے اسے ۶۵ ہزار پاؤنڈ کی پیشکش بھیجی لیکن رما نے رد کر دی۔ یہ محل "ونڈسر کاسل" کے بالکل قریب آٹھ ایکڑوں میں بسا ہوا ہے۔ دو نہانے کے تالاب' چارٹینس کورٹ' شجرستان' خود محل کے اکیس کمرے سب سجے سجائے۔ ایرانی قالین' بلوریں جھاڑ فانوس' نقرئی گلدان لیکن ساری فضا پر ایک حسرت برس رہی تھی۔ ایک ہوک سی اٹھی! کیا پرانے وقت ہوں گے جب راجہ مہاراجہ لندن میں آ کر اس دھج سے رہتے تھے۔ زمانے نے کیا پلٹا کھایا ہے۔ جو بھی سہی اس عہد رفتہ میں ایک رنگینی تھی۔ ایک وضع داری تھی۔ اس کے فراغ سیلوں میں ہزاروں فنکاروں' ناٹکوں اور دستکاروں نے برطانوی بے اعتنائی سے بچ کر پناہ لی۔ روزی اور تشفی پائی۔ افسوس راجہ نواب تو مٹ گئے' لیکن ان کی جگہ نئے ساہوکاروں نے صرف دولت کمائی مگر اس کا صحیح مصرف نہ جانا۔ ہمارے مصور' مصنف آج بھی دربدر پریشان حال پھر رہے ہیں۔

لندن میں پھولوں کی ایک مخصوص نمائش (Chelsea Flower Show) ہوتی ہے۔ اس کے ٹکٹ سال بھر پہلے بک جاتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ایڈمرل گرمین کی نیم فرانسیسی بیوی جوڈی میرے مختلف مشاغل سے واقف تھی۔ اس نے اپنے میاں کے ٹکٹ پر مجھے مدعو کیا۔ دن مقرر' وقت مقرر' ملنے کی جگہ فلاں ٹیوب اسٹیشن کے دروازے پر دس بجے قرار پائی۔ ہم دونوں

KitaabPoint.blogspot.com

عین وقت پر ٹیوب اسٹیشن کے دروازے پر بے چینی سے دو گھنٹے تک ایک دوسرے کا انتظار کرتے رہے۔ وجہ یہ تھی کہ ٹیوب اسٹیشن کے تین دروازے ہیں اور پروگرام طے کرتے وقت دونوں یہ مقرر کرنا بھول گئے کہ کون سا دروازہ...... خیر دو گھنٹے کی کوفت ڈھل گئی۔ جب ہم نمائش میں داخل ہوئے۔ بلاشبہ یہ بین الاقوامی پھولوں میں اولین تھی۔ ہر ملک نے اپنے سٹال سجائے تھے۔ افریقہ یورپ ایشیا کا کوئی پھول ہوگا جو نہ پہنچا ہو۔ ''سویٹ پنیز'' کی ۳۳ قسمیں گلاب کی ۱۵۵ کاسنی گلاب اور سیاہ فام گلاب میں نے پہلی دفعہ وہاں دیکھے۔ چٹائیوں پر انہوں نے کئی قسم کی ''ٹرف'' اگا رکھی تھی۔ میرے مولانے اس مشت خاک میں کیا کیا تاثیریں پنہاں کی ہیں۔ ان بے کیف مٹی کے ذروں سے کیا کیا مخملیں ریشمیں رنگ پھوٹتے ہیں۔ کیا کیا حسین خط و خال ابھرتے ہیں۔

''ڈیفنس کالج میں یہ لطیفہ زد زبان ہوا کہ مسز ریاض اپنے میاں کے گاڑھے پسینے کی کمائی تھیٹر میں ضائع کر رہی ہے۔ یہ سچ تھا کہ میں نے صرف ''ریویو'' چھوڑے اور کچھ نہیں چھوڑا۔ ہر ہفتے ''سیلفرج'' کی بالائی منزل پر جا کر دو چار ٹکٹ بک کروا آتی تھی۔ عموماً دوپہر کو میٹنی کے جب میاں صاحب اور بچے گھر پر نہ ہوں۔

آٹھ دس شلنگ میں خاصی اچھی نشست مل جاتی تھی اور لندن کا معمولی ڈرامہ بھی اور ملکوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ یہ عجب بات ہے کہ انگلستان میں فلموں پر زبردست اخلاقی پابندیاں عائد کی گئی ہیں لیکن تھیٹر کو Censor اور لارڈ چیمبرلین نے کھلی آزادی دے رکھی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی عریانی ایسی نہیں جو سلیقے سے اسٹیج پر پیش نہ ہو سکے۔ ''گراہم گرین'' کے پر شرارت مکالمے ''ارمالا ڈوس'' کے طوالفی جملے سن کر میرے کان سرخ ہو جاتے تھے۔ لندن اسٹیج کے پانچوں گرو جو گنگ آرتھر کی گول میز کے ''نائٹ'' کہلاتے ہیں۔ باری باری مختلف ڈراموں میں دیکھے۔ ''سرالیک گی نیس'' کو لارنس آف عریبیا کے لباس میں دیکھا اور پول سکوفلیڈ لے سر مائیکل ریڈ گریو سر رلیف رچرڈسن کے خداداد ہنر کی نت نئی گہرائیاں دیکھیں۔

دیکھیں۔

ایک سادی شام ''سرجون گیل گوڈ'' کے ساتھ گزاری۔ شیکسپیئر کے مختلف المیہ، مزاحیہ تاریخی ڈراموں اور نظموں کو اس شخصیت نے تین گھنٹے اسٹیج پر تن تنہا پیش کیا۔ ہر دفعہ مختلف انداز میں مختلف کرداروں کو جس طرح شیکسپیئر نے صفحہ پر تشکیل دیا۔ یہ محض آواز اور ادائیگی سے پیش کرتا تھا۔ ہم بھول جاتے کہ اوتھیلو یا ہنری چہارم کا زمانہ نہیں بلکہ بیسویں صدی کا لندن ہے جہاں گیل گڈ کوٹ پتلون میں یہ مکالمے ادا کر رہا ہے۔ تین گھنٹے متواتر بغیر لباس بدلے بغیر کتابی مدد لیے اس تھیٹر کے جن نے ہمیں مسحور کر دیا تھا۔ جب آخر میں اس نے ''کنگ لیئر'' کے وہ نالے سنائے جو وہ اپنی بیٹی کارڈیلیا کو موت کے بازوؤں میں بناتا ہے تو دل تو کیا سارا ہل گیا۔ جس وقت

KitaabPoint.blogspot.com

وہ معمر فنکار Howl کہتا تھا۔ ساری فضا جھنجنا جاتی تھی۔ واللہ اعلم کہاں سے آواز نکالتا تھا۔ سنا ہے یہ اس پیر کامل کا موروثی راز ہے جو سینہ بہ سینہ چلا آیا ہے۔ جسم کے ڈھانچے سے ایسی آوازیں نکالتا کہ کوسوں دور قبر کے مردے جگا دے۔

لندن اسٹیج کی نامی گرامی لقب یافتہ ایکٹریس بھی دیکھی اور قائل ہو گئے۔ ڈیم فلورا روبسن' ڈیم سبل تھورن ڈائیک ڈیم جوڈتھ اینڈرسن ...... یہ خواتین کتنی ہی عمر رسیدہ ہوں' ان کا فن ہمیشہ جوان رہے گا۔ ایک شام ہمارے پاس دعوت نامہ آیا۔ لارڈ چانسلر کا ملکہ معظمہ نے ساڑھے چار بجے پارٹی پر یاد فرمایا ہے۔ حاشیہ میں لکھا تھا۔ "بشرطیکہ بارش نہ ہوئی۔" یہ لندن کا موسم اپنی ملکہ کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔ خیر صاحب ہم تیار ہو کر اس دن پہنچے۔ ایک خلقت امڈی ہوئی تھی۔ بکنگھم پیلس کے کشادہ لان میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ویسے یہ باغ انگریزی لحاظ سے بہت کمزور قسم کا ہے۔ ہمارے گورنمنٹ ہاؤس اس سے بہتر ہیں۔ اللہ ہو غنی! انگلستان کے جدی روسا ٹیل کوٹ اور تحفوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ بعض کے سینوں پر اتنی تعداد میں تمغے لٹک رہے تھے جو اکثر شعبدہ بازوں کی وردی پر ہوتے ہیں۔ بعض لارڈز اور نائٹ اتنے عمر رسیدہ تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری انیسویں صدی انہوں نے گود میں کھلائی ہے۔ بعض تو مکفون مردے نظر آتے تھے جو قبر پھاڑ کر اپنی سامراجی عظمت کو دوبارہ چکھنے نکل آئے ہیں۔ کئی کی پلکیں بھنویں سفید ہو کر جھڑ چکی تھیں۔ بعض نے کالی پنسل کے ابرو کھینچے ہوئے تھے۔ مجھے ایک دم کراہت آئی۔ بہت زیادہ نکھری ہوئی سفیدی دیکھ کر یوں احساس ہوا کہ Decent Aristocracy کیا چیز ہو سکتی ہے۔ ان کی جڑیں کہر زدہ تھیں۔

کچھ دیر بعد ہلکی پھوار شروع ہو گئی۔ اگر یہ اصیل نہ پڑتی تو لندن والے اس پارٹی کو مستند کیسے مانتے۔ اگر انگلستانی شے ہے تو ضرور سیلی ہوئی ہو گی۔ پلک جھپکتے میں ہزاروں چھتریاں کھل گئیں۔ یا اللہ یہ کہاں سے آئیں۔ کیا محل میں کرائے پر چلتی ہیں۔ پتہ چلا کہ ہر مرد کے ہاتھ میں جو نازک سی چھڑی تھی۔ وہ اصل میں چھتری تھی۔ میں سمجھی کہ یہ چھڑی ٹیل کوٹ کے ساتھ لازمی دم چھلا ہے۔ اتنے میں بینڈ بجا اور ملکہ کی آمد کے لیے چوبداروں نے راستے بنانے شروع کئے۔ مہمان پلے پڑ رہے تھے زیارت کے لیے' محل کے ڈپٹی نے ان کو ہٹا ہٹا کر قطاریں لگوائیں تاکہ ملکہ ہر ایک کو ذرا ذرا مسکراہٹ بانٹ سکے۔ ہاتھ ملانا تو ناممکن بات تھی تو خیر صاحب انتظار ختم ہوا۔ برطانیہ کی جوان ملکہ جو ابھی زچگی سے اٹھی تھیں داخل ہوئیں۔ چہرے پر چھائیاں رنگت پیلی' ہنسی کھسیائی ہوئی۔ کیا یہ مکھڑا تھا جسے بی بی سی کے ناشر نے گلاب سے تشبیہ دی تھی۔ پوچھا ہو تو ایسی۔ انگریز اس شاہی چہرے کی زیارت کے لیے دو دن پہلے قطاریں لگانی شروع کر دیتا ہے۔ مجھے اس پر "جارج مکیش" بے ساختہ یاد آ گیا۔ اس نے انگریزوں کا خاکہ اپنی کتاب میں اڑایا ہے۔ لکھا ہے "انگریزوں کو باہر کھلی فضا میں سیر و تفریح کا بہت جنون ہے بشرطیکہ وہ قطاریں لگا سکیں۔" پچھلی جنگ عظیم میں ہر چیز کے لیے قطار

KitaabPoint.blogspot.com

لگاتے لگاتے اب یہ مجبوری ایک قومی شغل بن گئی ہے۔ ایک اور جملہ اس مزاح نگار کا یاد آیا۔ ''فرانسیسی کے پاس جنسی لذت اور انگریز کے پاس گرم پانی کی بوتل''

ہمارے قیام میں ہر قسم کے مہمان آئے۔ لیکن ایک مہمان بلائے جان تھے اور وہ تھے' راجہ غضنفر علی۔ ویسے میں اور میرے میاں ان کو ایک بزرگ کی طرح مانتے ہیں (جس لفظ بزرگ پر وہ چڑ بھی جاتے تھے) لیکن ان کے دل کا کسی وقت اعتبار نہیں تھا۔ تھرمبوسس کے دیرینہ مریض تھے۔ سیڑھیاں وہ چڑھ نہیں سکتے تھے۔ اپنی بنگالی مالکن کی منت کر کے نیچے کمرہ خالی کرایا لیکن راجہ صاحب اس قدر زندہ دل تھے کہ اوپر پہنچ جاتے تھے۔ ہزار سمجھایا' ڈاکٹروں نے دھمکایا' کوئی اثر نہیں۔ لیکن یہ زندگی کے شیدائی ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آتے ہی پوچھنے لگے۔ میں کیا کیا دیکھوں۔ میں بولی' آپ نے تو چپہ چپہ دیکھ رکھا ہوگا۔ بولے مطلق نہیں ۱۹۲۸ء میں مہاراجہ بیکانیر کے ساتھ آیا تھا اور اس کی اردل میں رہا۔ مجرے دیکھے گھڑ دوڑ دیکھی مگر لندن نہیں دیکھا۔ کہاں ۱۹۲۸ء اور کہاں ۱۹۶۰ء.......

لندن نے اس عرصہ میں کتنی کروٹیں لیں۔ کتنی شکلیں بدلیں۔ بہرحال میں نے راجا صاحب کو برابر تین دن صبح سے شام لندن کے ''کوکس ٹور'' کے مزے دلوا دیے۔ دیکھ دیکھ کر ہانپ گئے لیکن شوق پھر بھی پورا نہ ہوا۔ شام کو مجھے اور ریاض صاحب کو نائٹ لائف دکھانے لے جاتے۔ میں کوئی مومنہ نہیں لیکن شبانہ زندگی کی نسواں عریانیاں دیکھ کر مجھے قلق ہوتا ہے۔ کسی صدی میں بھی عورت کو اتنا ذلیل نہیں کیا گیا جتنا کہ اب۔ پہلے عورت حرم میں ناچی' غلاموں کی منڈی میں ناچی لیکن اب ہر صفحے ہر پردہ سیمیں' ہر اسٹیج اور ہر اشتہار میں عریاں ہے۔ یہ عورت کا سراسر تجارتی و فحش استعمال ہے۔

بہرحال سب چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں گئے۔ لیکن پیرس کی نائٹ لائف کے بعد لندن کچھ مدھم اور بدمذاق معلوم ہوا۔ فرانسیسی اس نفاست سے نسوانی بدن پیش کرتے ہیں کہ احساس بھی نہیں ہوتا۔ خیر ایک شو برا نہیں تھا۔ ''ڈینی لارو'' جس کی ہیروئین بہت خوبصورت ہے اور حاضرین اس وقت اپنی حماقت کو سمجھتے ہیں' جب وہ ہیروین اپنے بال اور لباس اتار کر اور لباس کے نیچے سے دو گول ربڑ ہٹا کر اپنے کو اچھا خاصا مرد ثابت کرتی ہے۔

ہم ایک شام چارلی چپلن کی فلموں کا سلسلہ دیکھ کر واپس آ رہے تھے۔ دس بجے تھے لیکن راجہ صاحب کے لیے رات ابھی شروع ہو رہی تھی۔ بس کی لیڈی کنڈکٹر سے معصومانہ انداز سے پوچھتے ہیں۔ ہم اب کہاں جائیں؟ وہ ہنس کر بولی۔ ''سارا لندن تمہارے قدموں میں ہے جہاں کہو تمہیں لے چلیں۔'' راجہ صاحب کی بدولت سارے جوئے خانے بھی جھانکے۔ ایک سلور سٹی (جوا خانہ)

KitaabPoint.blogspot.com

پسند آیا جہاں شکاری کتوں کی ریس ہوتی ہے۔ آپ کو جو لمبی تھوتھنی پسند ہو پیسے لگا دیجئے۔ ہم نے بالائی نشستوں پر میز الگ کروالی اور وہیں ڈنر بھی منگوالیا۔ کھاتے جارہے ہیں اور ویٹر ہماری طرف سے ٹکٹ خریدتا جارہا ہے۔ اس ٹھاٹھ سے ہم نے کم جوا کھیلا ہوگا۔ کتے گھوڑوں سے بھی زیادہ چنچل اور سبک رفتار تھے کبھی راجہ صاحب کا کتا ہارتا تھا کبھی ہمارا۔ غرضیکہ اچھا خاصا لطف رہا۔ چند شلنگ ادھر یا ادھر۔ ریس کورس چاروں طرف بھرا ہوا تھا۔

انگریز قوم بھی جوئے کی بڑی دھتیا ہے۔ کچھ نہیں تو کتوں پر ہی شرط لگاتی رہتی ہے۔ اب ڈرابی کی ریس آرہی تھی۔ راجہ صاحب نے ہم سب کو تیار کر کے ٹکٹ بھی لے لیے تھے۔ اس ریس میں چرچل کا بھی گھوڑا تھا۔ ریاض صاحب کا قیاس تھا کہ چرچل بڑا خوش قسمت انسان ہے۔ اس کا گھوڑا ضرور جیتے گا۔ آپ نے چھ شلنگ لگا دیے۔ غریب ریس کے پہلے فرلانگ میں ہی لنگڑا ہو گیا اور اس کو گولی ماردی گئی۔ جوئے میں میری قسمت نے بھی کوئی خاص میرا ساتھ نہ دیا۔ انگریزی کا محاورہ ہے کہ محبت کے دھنی کو پیسہ نہیں ملتا۔ بہرحال ڈرابی کیا تھی' ایک میلہ تھا۔ کیا اژدھام' کیا شور! میں دعائیں مانگوں کہ یا اللہ راجہ صاحب نے جیتیں۔ کیونکہ ہر دفعہ مجھے پیسے لینے کے لیے لمبی قطار میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ راجہ صاحب اپنے دل کی وجہ سے بیٹھے ہوئے تھے اور ریاض صاحب اپنی ہار کے غم میں۔ ہر ادارہ ہر دفتر اپنی اپنی بسیں اور ٹرکس پر اپنے اپنے جھنڈے لگا کر آیا ہوا تھا۔ شاہی باکس الگ تھا جس میں برطانیہ کا سارا نیلا خون منجمد تھا۔ ملکہ الزبتھ سب سے زیادہ محظوظ ہورہی تھیں۔ ہر دوڑ میں کٹہرے سے آدھی آدھی باہر نکل کر تالیاں بجاتی تھیں۔

راجہ صاحب ہم کو دنیا کے سب سے فیشن زدہ ریس کورس Ascot پر بھی لے گئے۔ یہاں ہجوم کم ناز و انداز زیادہ۔ ایک سے ایک حسین نازنین یورپ کے انمول لباس میں تیتری سی ہلکی چھتری لگائے سامنے سے مٹکتی گزر جاتی تھیں۔ راجہ صاحب پہلی دفعہ گھوڑوں کو بھول کر ان غزالان رعنا کی دید میں مست ہو گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس سارے کھیل میں راجہ صاحب ۱۵۰ پونڈ ہار گئے تھے۔ سخت غصہ آیا۔ ان کی ان عادات کو اس عمر میں کون بدل سکتا ہے۔ ہمارے گھر سے بیٹھے بیٹھے ہالینڈ بیگم لیاقت کو ٹیلیفون کیا کرتے کہ وہاں جو گھڑ دوڑ ہورہی ہے۔ اس پر فلاں فلاں اصیل پر اتنے پیسے لگا دو۔ میں گرجی کہ اپنی نیلامی بول کر جائیے گا۔ وہ زمانے گئے جب آپ کی طرہ دار پگڑی پر بولی لگا کرتی تھی۔ مگر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ڈھٹائی اور بخت شاید ہم معنی ہیں۔ ایک ہفتے کے اندر اندر انہوں نے ہالینڈ میں رہ کر ۱۵۰ پونڈ واپس کما لیے۔ بیگم لیاقت بھی ان کی ہم پلہ نکلیں۔ راجہ صاحب نے بتایا کہ ان کے پاس بھی ہر گھوڑے کا شجرہ کھلا تھا اور ہزاروں فائلیں ان کی ریسرچ پر وقف تھیں۔

مہارانی جے پور کے ہم پرانے عاشق ہیں۔ اتنی ملیح اور حسین عورت کم دیکھی ہے وہ اس زمانے میں لندن میں تھیں۔ راجہ صاحب

KitaabPoint.blogspot.com

سے پرانے تعلقات تھے۔ انہوں نے "ونڈسر کاسل" میں ہم کو پولو پر بلایا۔ ڈیوک آف ایڈنبرا' ایک طرف کپتان اور دوسری طرف مہاراجہ جے پور بہت دلچسپ میچ رہا اور سارا خاندان معہ چار پشتوں کے قریب سے دیکھا۔ میں ابھی تک نہ سمجھ سکی کہ اس دور میں شہنشاہیت کا جواز کیا ہے۔ یہ تو اس طرح بے تکی معلوم ہوتی ہے' گویا اٹھارہویں صدی کی کترن کاٹ کر بیسویں صدی کی آزامی عبا پر پیوند کر دی گئی ہو۔

اصل میں لندن میں انسان دیوانہ ہو جاتا ہے۔ کیا کیا کرے اور کیا کیا نہ کرے۔ اخبار اٹھاؤ تو بہترین نمائشوں' سینما' تھیٹر' جشن موسیقی' ناچ گھر' لیکچر' مباحثے کے اشتہار' ہزاروں کورس مفت' کاؤنٹی کونسل کے کسی ادارے میں چلے جایئے۔ برٹش کونسل کی ممبر بن جایئے۔ وہیں دو چار معیاری محفلیں مہینے میں منعقد ہوتی ہیں۔ برٹش میوزیم کی لائبریری کے لیے ایک عمر دراز چاہیے لیکن چھوٹی چھوٹی لائبریریوں میں بھی ہمارے معاشرہ پر زیادہ کتابیں ملتی تھیں۔ بہ نسبت ہماری یونیورسٹیوں اور کالج کی لائبریریوں کے' اگر میں کسی کتاب کی کوئی فرمائش کرتی تو وہاں فوراً منگوا کر دیتے تھے۔ لندن میں نہایت چھوٹے چھوٹے سینماؤں کا سلسلہ ہے جسے کلاسکس (Classics) کہتے ہیں۔ یہ ہر علاقے میں ہوتا ہے۔ ٹکٹ تین سے چھ شلنگ تک کا۔ اس میں صرف بین الاقوامی انعامی فلم دکھائے جاتے ہیں۔ کئی ذرا معیوب' ہمارے مقیاس سے عریاں' لیکن فنی پیمانوں پر پورے اترتے ہیں۔ انہی میں ایک وقت چھ ایسی فلمیں چلتی ہیں جنہیں نہ دیکھنا عین محرومی ہے۔ ایک ہفتے میں لندن میں مندرجہ ذیل پروگرام چل رہے تھے۔

(۱) بین الاقوامی کھانے کی نمائش ۶۵ سٹالوں پر ہر ملک کے اپنے اپنے مخصوص و معروف طعام۔ اس کے نسخے مفت ملتے تھے۔ چکھتے چکھتے پیٹ بھر جاتا تھا۔

(۲) روسی سرکس۔ اس کا ذکر بیکار ہے۔ گھنٹوں لگ جائیں گے۔ خود دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر تھگلی لگانے والی قوم اکھاڑے میں کیا کیا کر سکتی ہے۔

(۳) "بہتر گھروں کی نمائش" دنیا بھر کے خانہ آراء (Interior Decorators) نے اپنے اپنے ملک کے تازہ ترین طرز زیبائش کا مظاہرہ کیا تھا۔

(۴) رام گوپال' اندرانی رحمان' روی شنکر کے مختلف کونسرٹ۔

(۵) ہسپانوی رقاص "انٹیونو" کا شو

(۶) فرانس کا بیلے

KitaabPoint.blogspot.com

(۷)وی آنا کا آرکسٹرا

(۸)بین الاقوامی کاروں کی نمائش

(۹)شنکراچاریہ مشن کے لیکچر

(۱۰)''پکاسو'' کی سب سے بڑی نمائش جو ٹیٹ گیلری کے دس بڑے ہالوں پر غالب تھی۔ چل چل کر جب میرے جوتے چھوٹے ہو گئے تو میں نے دونوں اتار کر ایک کونے میں رکھ دیئے۔ وہاں کا حاضر جواب چوکیدار بولا۔''انہیں الٹے سیدھے ٹانگ دوں تو یہ بھی ''پکاسو'' ہو جائیں گے۔'' قصہ کوتاہ' لندن کی ثقافتی سرگرمیاں سال تا سال ماہ بہ ماہ اسی رفتار' اسی معیار سے چلتی رہتی ہیں۔

لندن جا کر ایک بات سمجھ میں نہ آئی کہ وہ برطانوی قوم جو ہندوستان میں دو صدی رہ کر بھی مرچ مسالوں سے پرہیز کرتی تھی' ہند کو آزادی دیتے ہی اس قدر دیسی کھانے کی متوالی کیسے ہو گئی؟ لندن میں اپنا کھانے پکانے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ چپے چپے سے قورمے پلاؤ کی مہک آتی تھی۔ ہماری غذائی کلچر نے وہاں چین کو بھی مات دے دی۔ ساٹھ سے اوپر سو دیشی ریستوران ہر وقت کھچا کھچ (زیادہ تر سفید فام باشندوں سے) بھرے ہوتے ہیں جن میں عموماً بنگالی خانساماں اپنے کمالات دکھاتے ہیں۔ لندن میں کیا نہیں ملتا؟ دلی کی لذیذ ترین چاٹ کا مسالہ ڈبوں میں۔ سوکھی سرخ مرچ کا اچار۔ الفانسو آم' بنگال کے جلا جو گارس گلے' سبھی نعمتیں ہیں۔

اس کے بعد روحانی غذا کا بھی ذکر ہو جائے۔ یہاں تین مسجدیں ہیں۔ ایک ''ایسٹ اینڈ'' میں جو غریبوں کا علاقہ ہے (خدا اور کہاں بسے گا؟) دوسری ووکنگ میں' تیسری مسجد ''بیکر سٹریٹ'' میں غریبوں کی مسجد میں جنرل حق نواز اور میرے میاں کبھی کبھی وعظ کرتے جاتے تھے اور اسلامی تبلیغی مشن کو اخلاقی مدد بہم پہنچاتے تھے۔

عید پر مسجدوں میں سڑک تک نمازی ابل رہے تھے۔ کچھ پاکستانی اپنی انگریز بیویوں کو تماشا دکھانے لائے تھے۔ کچھ سیاہ جشنیں نیم عریاں فراکوں میں سجدے یا رکوع میں تھیں۔ کئی فرنگی بھی تھے جو نئے نئے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ کچھ دیر میں قورمہ پلاؤ نمازیوں کے سر اور کندھوں پر گھما گھما کر بٹنا شروع ہوا۔ مسلمان کھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خانہ خدا میں بھی مصروف غذا ہے۔

لندن کے نامی باغ کیو گارڈن میں جاؤ تو وہاں اشجار کی ایک الگ دنیا آباد ہے۔ وہاں کا رکھوالا بولا۔''ابھی تو ہم نے صرف چھ لاکھ اقسام کا تجزیہ کیا ہے۔'' خدا کی دنیا میں تو ابھی لاکھوں بوٹے اور بھی ہیں۔ اس باغ میں جب موقع ملا میں نے خاموشی سے دو تین دوپہریں گزار دیں۔ حسن اور سکون یکجا ہوں تو اور کیا چاہیے۔

''ہیمپسٹیڈ ہیتھ'' (Hampstead Heath) جس کے خشک سایوں میں کیٹس نے عشق اور وفا پر نغمے اور سانیٹ لکھے۔

KitaabPoint.blogspot.com

لندن کے ان کئی حصوں میں سے ہے جہاں وہم وگمان بھی نہیں ہوتا کہ اتنے دخانی کارخانے بھی اس شہر میں ہو سکتے ہیں۔ہائیڈ پارک میں اگر اتوار کو ٹہلنے نکلتے تو جگہ جگہ بھانت بھانت کے مقرر بقول شخصے پٹی الٹ کر تقریر کر رہے تھے۔اس میں ایک پچھم کی کہتے اور دوسرا پورب کی۔کوئی دہریہ کوئی ''میتھڈسٹ'' کوئی کیوبن کوئی جمیکن ۔ ہر ایک زبان مشتق گویائی میں مصروف ہے۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ایک طرف سے آواز آتی ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود کنوارے تھے اور کہتے تھے کہ صرف ۴۵ کنوارے جنت میں جائیں گے۔اس لیے صاحبان آپ بھی شادی نہ کریں۔دوسری للکار آئی۔کل سینٹ پال گرجا سے مذہب کا جنازہ نکلے گا۔آپ خود شرکت نہ کر سکیں تو کم سے کم ٹیلیویژن پر اس کی آخری شکل ضرور دیکھ لیں۔'' تیسری صدا آئی۔ ہمارا شاہی خاندان ذہنی بیماریوں سے پر ہے۔ہماری ملکہ خود بنگی ہے۔اس کا باپ شاہی وزد تھا لیکن ماں میں کسی بنئے کا خون ہے۔اس کا میاں اپنی سالی پر عاشق ہے۔یہ خبطی ملکہ...... میں نے سوچا۔پاس کھڑا سپاہی اب صبر نہیں کرے گا۔مقرر کو ضرور پکڑے گا۔لیکن توبہ کرو۔ملکہ جب ایک شہنشاہیت کے شیدائی نے مقرر پر حملہ کیا تو سپاہی نے حملہ آور کو پکڑ لیا۔ یہ ہے آزادی کا اصل روپ' دراصل جمہوریت!

میں Lake District کالج میں اکثر انگریزی ادب پڑھاتے ہوئے سوچتی تھی کہ یا اللہ یہ جھیلوں کا ضلع کیا شے ہوگی جس نے ہر شاعر کے کلام کو نئی ترنگ دی۔ ہر ادیب کو نئی تشبیہات دیں۔جس کا حسن خالق کائنات کی محبوب صناعی کہا جاتا ہے۔اللہ میاں نے میرے سب ارمان پورے کر دیئے ہیں۔''وٹ سن'' کی چھٹیوں کے ساتھ ہفتہ' اتوار ملا کر ہم اپنی نئی کار شیورلٹ میں روانہ ہوئے۔پہلی دفعہ برطانیہ کی نئی تیز رفتار شاہراہ پر ۸۰ میل کی رفتار پر کار چلائی جس کا انتہائی احساس ہوا' جو ہماری سڑکوں پر پچیس میل کی رفتار کا' لطف آ گیا ڈرائیوری کا۔ہمیں چلنے سے پہلے دوستوں نے وہ نصیحتیں کی تھیں کہ''لیک ڈسٹرکٹ'' ایک تو کار سے نہ جانا' دوسرے گرمیوں میں کبھی نہ جانا۔ہم نے دونوں نہیں مانیں۔ان تکلفات میں پڑے تو انسان کچھ نہ دیکھ پائے۔ان مندرجہ بالا نصیحتوں کے اسباب معقول تھے۔کہتے ہیں کہ اس خداداد علاقے میں موٹر کار سے داخل ہونا اس کے حسن کی بے حرمتی ہے۔ٹرین سے جاؤ' دور سے ریلوے اسٹیشن پر اتر جاؤ اور پھر پیادہ کندھے پر زنبیل ڈال کر جگہ جگہ اس کنچن کایا کا تیرتھ کرو۔جہاں مرضی ہو رکو' جہاں مرضی ہو سوؤ۔یہ واقعہ ہے کہ یہی بہترین طریقہ ہے اس خطے کو دیکھنے کا۔کیونکہ کار سڑک سے جو کچھ دکھا سکتی ہے' وہ محدود نظارہ ہے۔ اس کے بے پناہ اندرون میں انسان اطمینان سے گم ہو سکتا ہے لیکن پیدل چلنے کے لیے نہ ہمارے پاس وقت تھا نہ تجربہ۔گائیڈ کی تفصیلی ہدایات پڑھ کر دوڑ گئے۔

KitaabPoint.blogspot.com

۱۔اپنے ساتھ موٹے خاردار جوتے لائیں۔

۲۔ایک دبیز برساتی جو وقت پڑے خیمہ بھی بن جائے۔

۳۔چوبیس گھنٹے کا کھانا یا کم سے کم پودینے کا کیک' آپ کی کمر کی پیٹی سے بندھا ہو۔

۴۔شوخ رنگ کے (ترجیحاً لال) کپڑے پہنیں تاکہ لائف گارڈ دور سے دیکھ کر آپ کو بچا لے۔ جب بھی سورج غیر حاضر ہو تو کہر ایک دم اندھیرے کی طرح چھا جاتا ہے۔

۵۔ایک عدد جہاں نما اور سیٹی بھی لازم ہے۔ہم نے سوچا خدا نوبت نہ لائے کہ سیٹی کی ضرورت پڑے۔ ہماری موٹر کا ہارن ہی اچھا۔

ہمارے سوات کی طرح اس خطے کو دیکھنے کے لیے کہتے ہیں کہ اکتوبر یا اپریل کا موسم بہترین ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں گرمیوں میں نہیں آنا چاہیے کیونکہ یکساں موسم منظر میں بھی یکسانیت پیدا کر دیتا ہے۔ صاحب یہاں ہمیں تو اس یکسانیت میں بھی تنوع نظر آیا۔ ایک ایک وادی میں پانچ پانچ رنگ۔ کہیں پتے جامنی کہیں زعفرانی' کہیں کھیت زیتونی یا دھانی۔ درخت تانبے کی طرح تپ کر بھڑک رہے تھے۔ بہت کم مقام ہیں جہاں کائنات کے فنکار نے حسن کے تمام حربے استعمال کر ڈالے۔ ایک طرف انگلستان کے بلند ترین پہاڑ جن پر دور دور برف کی سفید شہادتیں نظر آتی ہیں اور اشجار سے ڈھکے ہوئے چھوٹی بڑی سو سے اوپر جھیلیں۔ جن کے شفاف پانی میں اپنا چہرہ دیکھ کر "میک اپ" درست کرنے کو جی چاہے۔ ہزار ہا اقسام کے خودرو پودے' پھول بوٹے۔ جگہ جگہ نوکیلی گھاٹیاں۔ پوشیدہ وادیاں' جہاں انسان کم اور گلاب زیادہ۔ وحشی جانور تو شکاریوں اور شاہی خاندان کی نذر ہو گئے۔ اب ہرن' خرگوش' لومڑیاں' سرخ گلہریاں' پرندمرغابیاں وغیرہ ہیں۔

کئی جگہ ایسے مقام آئے تھے کہ کار روک کر سانس روکنا پڑتا تھا۔ حسن اپنی پوری رعنائی میں نیم عریاں لیٹا ہوا ہے۔ نظر کی وسعت ہی آپ کو دغا دے تو آپ کی کم نصیبی' ورنہ جہاں تک دیکھ سکتے ہیں دیکھیے۔ کس سنگتراش کی چھینی اور کس چتر کار کا قلم ہو گا جو قدرت کے تین زاویے کو اس طرح پیش کر سکے؟ یہاں ننھے ننھے کلیسا بھی نظر آئے۔ یہ پادری بھی ہر مشکل جگہ مذہبی سرنگ لگا کر پہنچ جاتے ہیں اور سادہ لوح دیہاتیوں' پہاڑیوں کو تواری وعظ دیتے ہیں۔ میری رائے میں تو یہاں رہنے والوں کو اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ جو جگہ یزدان کل کا عیاں عکس ہو جس کے ہر رخ سے خداداد حسن کی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں وہاں اندھیرے گرجے میں لا کر لوگوں کو کیا بتانا کہ خدا بھی ہے؟ ہم نے سب سے پہلے بڑی جھیل (Lake Winder Mere) کا قصد کیا۔ یہ جھیل کیا ہے؟ تقریباً

KitaabPoint.blogspot.com

ایک بالغ دریا ہے جہاں اسٹیمر چلتے ہیں۔ہم سے بہت پہلے یہ جھیل مصوروں کا مسکن تھی۔قدرت کے نقالوں نے اس کے ہر بوٹے کو فیتے سے ناپ کر رنگوں میں اتارا ہر مسکین گائے اور بھیڑ کو روک کر اس کی بھدی دم سیدھی کرنی چاہیے تاکہ فن میں بھی دم سیدھی نظر آئے لیکن اب تو کاروں میں ہماری طرح سیاح بھرے ہوئے تھے۔گلوں میں کیمرے، دوربین اور جن کو پیسے کی نہیں وقت کی کمی تھی لیکن ہمیں یہ جھیل ایک آنکھ نہ بھائی۔وہی ماڈرن تفریحات کے لوازمات۔وہی کاروباری تفریح کے ٹکٹ۔فوٹو گرافر۔ہوٹ ڈوگ' آئس کریم کے بوتھ۔

اس جھیل کی روح تو بیسویں صدی کی بھینٹ چڑھ گئی۔دور دور اس کے قدرتی جوبن پر حکومت کی مقراض چلی۔جب قدرت اپنی آزادی بیچ کر پالتو ہو جائے تو پھر مزہ نہیں آتا میں وہاں بچوں کے اصرار پر مشکل سے چند گھنٹے ٹھہری۔ہماری اگلی منزل ''گراس میئر'' تھی۔یہ جھیلی علاقے جن میں صحیح معنوں میں رومان تیر رہے تھے۔پہاڑیاں پر اسرار، وادیاں عمیق تر اور اوپر آسمان بادلوں کے گالوں میں اڑا چلا جا رہا تھا۔جب سورج برآمد ہوئے تو دونوں جھیلیں ایسی چمکیں کہ کالی عینکیں لگانی پڑیں۔''گراس میئر'' سارے علاقے کا سماجی مرکز ہے جہاں کھیل کبڈیوں اور کشتیوں کے مقابلے ہوتے ہیں۔ساتویں صدی کا گرجا آثار قدیمہ میں سب سے نمایاں ہے۔اردگرد کافی سخت جان پہاڑ ہیں جن پر کوہ رفتار اپنی زور آزمائی کرتے ہیں۔گراس میئر کی سب سے خصوصی نمائش گاہ رومانوی تحریک کے ہادی کا گھر Dove Cottage ہے جہاں ورڈز ورتھ نے اپنے اپنی بہن اور پھر اپنی بیوی کے ساتھ زندگی کا بیشتر حصہ (۵۱ سال) گزارا۔یہیں پر قریب کلیسا میں ان کی کتبہ کندہ قبریں بھی ہیں جہاں ہم نے اسی شاعر فطرت کی مغفرت کے لیے دعا کی اور اس بیچارے کو مغفرت کی ضرورت بھی بہت ہو گی کیونکہ یہ قدرتی مناظر کے بیان میں' ایک پیغمبری حیثیت رکھتا تھا لیکن ......اور اس ''لیکن'' میں بہت کچھ پنہاں ہے۔یہ شاعر زبردست اخلاق ڈھکوسلہ تھا۔پہلے اپنی محبوبہ کو فرانس میں دھوکہ دیا۔پھر اپنے سیاسی دوستوں کو دغا دیا۔یہاں کے باسیوں کا دعویٰ ہے کہ ورڈز ورتھ تو کیا کسی ''کور ذوق'' کو لے آؤ تو آتے ہی ایسی آفاقی حسن کے سامنے شاعر بن جائے گا۔جب کوئی شخص ''بدمست'' خود سے ہم کلام چلتا نظر آئے تو یہ دہقان زیر لب ہنستے ہیں کہ اس کی بھی پتی اچھل آئی۔یہ حقیقت ہے کہ ان دلفریب نظاروں میں مجھ جیسی غیر شاعرانہ طبیعت کی بھی پتی اچھل آئی۔لیکن افسوس! ان کوہساروں' چمن زاروں کو کون بیان کر سکتا ہے۔قلم رنگین مووی کیمرہ نہیں کہ جیتے جاگتے فوٹو اتار لے! اور گھر آ کر دوبارہ پروجیکٹر پر طلسمی یادوں کو منعکس کرے۔

ہم نے اس تمام سفر میں ایک عہد کیا تھا کہ ہوٹل میں ہرگز نہیں ٹھہریں گے۔چاہے کتنا سستا ہو۔اس علاقے کے لوگ بہت مہمان

KitaabPoint.blogspot.com

نواز اور خلیق وسادہ سچے انسان ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں جب سیاح شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھنا کو نکلتے ہیں تو یہ لوگ اپنے گھر کے دروا کر دیتے ہیں۔ صرف چھ سات شلنگ فی کس میں اچھے صاف کمرے اور گرم گرم صبح کا ناشتہ دیتے ہیں۔ اور پھر یہ جگہ ہوٹل کی مصنوعی گھٹن سے پاک ہے۔ دوسری رات ہم نے پڑاؤ "فیل اینڈ فارم" میں ڈالا جو "کیزک" (Keswick) کے قریب تھا۔ یہ ایک صاحب جائیداد کسان کا "کاٹیج" تھا جس کے اردگرد اس کے کھیت اور ننھے باغیچے تھے۔ مالکن ایک موٹی، مشفق اور معمر عورت تھی جس کے پانچ نوجوان بیٹے کھیتی باڑی کرتے تھے۔ کہاں ہمارے کسان کہاں یہ صاف ستھرا گھر، بلکہ دو گھر۔ فرنیچر بھدا پرانا، لیکن مکمل اور صاف۔ ہمارے ساتھ راجہ صاحب بھی تھے۔ ان کے لیے ہم نے برابر کے "کاٹیج" میں ایک الگ کمرہ لے لیا تھا لیکن وہ اپنے غیر معتبر دل کی وجہ سے اکیلے سوتے گھبراتے تھے میں جب منہ دھو کر کمرے میں آرام کے لیے داخل ہوئی تو کیا دیکھوں کہ راجہ صاحب ایک بستر پر ناک تک چادر تانے دراز ہیں اس وقت وہ بالکل اس بھیڑیے کی طرح لگ رہی تھے جو "ریڈ رائڈنگ ہوڈ" کی نانی کا سوانگ رچا کر پلنگ میں گھس گیا تھا۔ میں بچیوں کے کمرے میں چلی گئی اور یہ بزرگ ریاض صاحب کے ساتھ سوئے۔

ہمارے ساتھ ہلالی صاحب کا ولی عہد ناصر بھی تھا جو بہت پیارا اور چونچال ساتھی تھا۔ اس غریب کے لیے کوئی الگ پلنگ نہ تھا۔ یہ پشت کے ہال میں صوفے پر سو گیا لیکن اس کی قسمت میں چین نہیں تھا۔ ہمارے دہقان میزبان کی بھینس نے اسی رات بچہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ساری رات وہ دردوں میں ڈکارتی رہی۔ پھنکاریں مارتی رہی۔ ناصر غریب کی پلک نہ جھپکی صبح کاذب ذرا آنکھ لگی تو کسان کے پالتو کتے نے منہ چاٹنا شروع کر دیا۔

صبح بقرعید تھی ہم سب نے نہا دھو کر نماز پڑھی۔ ایک دوسرے کے گلے ملے۔ زر مبادلہ میں کم بخت عیدی دی۔ سب سے زیادہ چٹی راجہ صاحب پر پڑی کہ ہم سب ان کے چھوٹے تھے۔ ہماری مہربان میزبان نے ناشتے پر چھ قسم کے جیم جیلی (سب خالص گھر کے بنے ہوئے) شہد مکھن، کرارے ٹوسٹ، دودھ وانڈے، کیک، چائے، پھل سجا دیے۔ میز بھر گئی مگر ہماری نیت نہیں بھری۔ چلتے وقت سارا بل کل ڈیڑھ پاؤنڈ کا تھا۔ بڑی بی نے بچوں کے نصف دام لگائے۔ ناصر ساری رات بھینس کا زچگی میں ساتھ دے چکا تھا۔ صبح بھنایا ہوا تھا۔ جب کار چلی تو کچھ دور جا کر بولا۔ "اختر آپا آج بقرعید ہے اور خاص اس موقع پر اس سارے فرنگی فریب میں ایک مسلمان نہیں جو قربانی دے۔ اس ننھی سی جھیل پر کار روک کر ذبح کروں؟"

میں نے کہا۔ "کسے؟"

بولا "بھینس کے بچے کو۔"

KitaabPoint.blogspot.com

میں نے سوچا کہ ہر مشہور جھیل تو دیکھنی ناممکنات میں سے ہے۔قوانین کائنات بھی چناؤ پر مبنی ہے۔ چھانٹو اور دیکھو۔اس پر بھی آٹھ تو پڑاؤ ہو گئے۔ "کیزک" ہم گھومے' کچھ ٹاروں پر کچھ تانگوں پر۔کئی گوشوں میں ایسا سکون تھا کہ گویا یہ چیدہ چیدہ نیک روحوں کا مسکن ہے۔جو بادلوں کی طرح حسن اور خاموشی میں جذب ہو جاتی ہیں۔

گزشتہ زمانے میں یہ علاقہ دو یادوں کے ساتھ وابستہ تھا۔ایک تو اس کی گھوڑا گاڑیاں جن کو محبتاً "کوچی" (Coachees) کہا جاتا تھا۔ان کے ڈرائیوروں کی پھکڑ جملے بازیاں ایک کہاوت بن گئی ہیں۔دوسری وابستگی اس علاقے کو "کولرج" سے ہے جو اپنے ننھے بیٹے اور شریک حیات کے ساتھ "گریتاہال" میں عرصے تک مقیم رہا۔اسی دوران میں کئی شاعر اور مصنف آتے جاتے رہے جس سے اس کا نام آنی بل پڑ گیا۔"آلز واٹرز" (Ulls Waters) انگریزی جھیلوں میں سے سب سے زیادہ "نیک خصلت و خاندانی" سمجھی گئی ہے اس کے تینوں راستے پر امن ہیں۔اس کی چراگاہوں میں گلے منہ جھکائے اس سکوت سے چر رہے ہوتے ہیں کہ پکچر پوسٹ کارڈ معلوم ہوتے ہیں۔یہاں کے پانی دن کی روشنی کے ساتھ ساتھ اپنے کئی رنگ بدلتے ہیں۔یہاں گھاس پر چلنے کو دل نہیں چاہتا کہ کہیں یہ زمردیں زیست پامال نہ ہو جائے۔یہ علاقہ اپنی "صدائے بازگشت" کے لیے مشہور ہے کوئی پٹاخہ کوئی دھماکہ ہو۔دیر تک پہاڑ گونجتے رہتے ہیں۔اس شور سے سنا ہے کہ وہاں کی جنگلی مرغابیاں اپنے مانوس پانی چھوڑ کر کہیں اور چلی گئیں۔کئی سانڈ اپنی ڈکار کی گونج سن کر پاگل ہو جاتے ہیں۔واللہ اعلم!

"ڈرونٹ واٹرز" (Derwent Waters) کے کنارے پر ہم نے آدھے دن پکنک کی' خوب تیرے۔(اس دن سورج خوب جوبن پر تھا) ایک دوسرے کی پانی میں خوب گت بنائی۔راہرو بہت کم۔ہماری "شیورلے" کار اس سادہ جھیلی علاقے میں ایک عذاب جان تھی۔

سارا کنبہ معہ سامان کے آرام سے آ جاتا تھا لیکن وہاں کے سادہ لوح باشندے "شیورلے" کے تازہ ترین ماڈل سے ناواقف تھے۔آتے جاتے ہم سے اس کی رونمائی کرواتے۔فرمائش ہوتی۔اس کا انجن کھول کر دکھاؤ کیسا ہے۔ادھر راجا صاحب نے میری چڑ بنالی۔میں جب وجد میں آ کر "لیک شاعروں" کی نظمیں دہراتی تو وہ اپنے مخصوص لہجے میں (جسے وہ میرے لیے جان کر اور کرخت بناتے تھے۔

Home Home Sweet Home .... گانے لگتے تھے۔اس لہجے کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تو یہ ہوگا۔

Hom Hom Saveet Hom

KitaabPoint.blogspot.com

خیر یہ میری نازک مزاجی کی سزا تھی۔ ان کائناتی وسعتوں میں جہاں شاعری پروان چڑھی۔ راجہ صاحب جیسے مسخرے ہم سفر بنے۔ اس سارے سفر میں ایک بات کا احساس ہوا۔ وہ یہ کہ اس علاقے کی بارش ایک آفاقی شخصیت ہے جس میں زندگی جیسا تنوع ہے۔ ہر دفعہ اس کے رنگ بدلتے رہتے تھے۔ کبھی سیپ کی طرح دبی دبی دمک کبھی ملتانی مٹی کی طرح مٹیالی مہک۔ کبھی سفید کبھی سیٹی یہ آبی آسیب کبھی پیچھے پیچھے چلے۔ پھر ایک موڑ پر ہم سب سے آگے پھر رک گیا۔ پھر دھوپ میں سے چھن چھن کر برسنے لگا۔ پھر غائب۔ ہم نے کہا۔ اس کے پینترے سیاسی ہیں۔ اس کو روٹ ملنا چاہیے۔ شام کو ذرا تازہ دم ہو کر چائے پی کر باہر نکلے تو قریب ہی ایک گاؤں میں آتش بازیاں چھوٹ رہی تھیں۔ ہم ٹہلتے ٹہلتے پہنچے۔ وہاں دیہاتی میلہ تھا۔ ہم لوگ تفریح پر تلے ہوئے تھے۔ ڈوجم (Dogems) میں ریاض صاحب اور بچیوں نے خوب دنادن ٹکریں لگائیں۔ ''گھومتے گھوڑوں'' پر بیٹھے۔ مشینی جوا کھیلا۔ جس میں راجہ صاحب پیش پیش تھے۔ پھر نشانہ بازی کا اسٹال نظر آیا۔ پانچ نشانوں میں اگر سب مصنوعی خرگوش اڑ جائیں تو انعام۔ راجہ صاحب کے دو خطا ہوئے۔ ریاض صاحب کا ایک میرے پانچوں خرگوش گولی کھا گئے۔ دونوں مرد بہت کچے ہوئے۔ جتنا وہ بات اڑانا چاہیں۔ میں اتنا ہی چڑاؤں۔ جب انعام میں ''شیونگ کریم'' نکلی تو پھر میری شامت آئی۔ سامنے کونے پر جو نظر پڑی تو ایک سکھا شاہی پگ چوڑیاں بیچ رہی ہے۔ آواز آئی۔ ''بھین جی! آپ کو تو ضرور پہنائی ہیں۔'' یارب یہ سکھ اس علاقے میں بھی اپنی دہی آلود داڑھیاں لے کر پہنچے ہوئے ہیں۔ ان سے کہاں مفر ہوگا؟ ہمارا آخری پڑاؤ ''بڑمیئر'' پر تھا۔ یہ جھیلی بستی سب سے چھوٹی۔ سب سے تنہا۔ سب سے سحر انگیز!!! دور دور گھنے درختوں کی سبز سازشوں میں اکا دکا خیمے میں حسن وعشق ہم آغوش لیٹے تھے۔ آفتاب اپنی آخری حدت ہار چکا تھا۔ سائے ڈھلنے شروع ہوگئے۔ سامنے پہاڑیوں سے جھرنوں کی قل قل! میں نے اتنے سریلے آبشار کبھی نہیں سنے۔ دائیں طرف نباتاتی انبار جن میں سے عجیب نوع کی ہلکی ہلکی مہک آرہی تھی۔ غالباً کوئی بیل یا بوٹی اپنا معطر راز افشا کر رہی تھی۔ جھیل کے بے بل آئینے میں آسمان جھانک رہا تھا۔ یک لخت کہیں سے ہوا چلی اور ہلکا سا ہیجان برپا ہوگیا۔ ڈوبتے سورج کے شہتیر پانی پر برسنے لگے۔ آنکھوں میں ترمرے ناچنے لگے۔ موج اور کرن میں تمیز مشکل ہوگئی۔ اس ڈلک ڈلک کرتی جھیل کے رنگیلے حاشیوں پر بادامی پام جن کے لمبے لمبے گوش پانی پر آویزاں تھے۔ اس جلوے کے رعب سے میرا سانس بند ہوگیا۔ اور آنسو جاری ہوگئے۔ اس وقت خالق کائنات میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس یزدانی حسن کے سامنے نہ انسان یاد آیا' نہ اس کے مظالم' نہ معرکے نہ معاشقے۔ میں اکیلی دیر تک عبادت حسن میں محو رہی۔

ورڈز ورتھ کی سطور جن کو میں نے بارہا پڑھا اور سنا تھا۔

I have felt a presence that disturbs me with the joy of elevated

KitaabPoint.blogspot.com

thoughts, A sense sublime of something far more deeply inter-fused whose dwelling is the light of setting suns.

میں نے پہلی دفعہ سمجھا۔

لندن کا دوسرا رخ: ستمبر ۱۹۶۵ء

اس دفعہ لندن وہی تھا لیکن میں بدلی ہوئی تھی۔ اپنی جنگ نے تو دل و دماغ ماؤف کر دیئے تھے۔ میں نے اپنے پرانے فلیٹ کو بک کرا لیا تھا۔ لیکن میری مخلص سہیلی بیگم ہلالی نے مجھے وہاں رہنے نہ دیا۔ حالانکہ ان کا گھر دھرم شالہ بنا ہوا تھا۔ سب پاکستانی سیاحوں نے وہیں آسرا لیا تھا۔ سب کے خیالات پر اپنا وطن چھایا ہوا تھا۔ صرف میری سہیلی کے نقرئی قہقہے ہم سب کی ہمت اور امید ٹوٹنے نہیں دیتے تھے۔ لندن کی مجموعی فضا میں بہ نسبت امریکہ کے زیادہ دوستی تھی۔ اخبارات' ٹیلیویژن (سوائے خالہ بی بی سی کی اولین زیادتی کے) ریڈیو دونوں رخ پیش کرتے تھے اور جب کوئی مغربی ملک غیر جانبدارانہ انصاف کرے تو یقیناً وہ ہمارے حق میں بولتا ہے کیونکہ ہمارا Cause ہی ایسا ہے۔ ٹیلیویژن کے پینوراما نے ہماری ساری جنگ لاہور سے سیالکوٹ اور اکھنور تک دکھائی۔ لیکن ہندوستان کے ایک محاذ پر بھی اسے جانے کی اجازت نہ ملی۔ ادھر ہمارے سپہ سالار سے ادنیٰ سپاہیوں تک گفتگو سنائی۔ ادھر ایک ''انڈین ایکسپریس'' کا کٹر مدیر دوسری مادام وجے لکشمی پنڈت بمعہ اپنے گیسوئے سیمیں فرماتی ہیں۔ ''مجھے حیرت ہے کہ مسٹر ولسن نے پاکستان کی بلا تکلف حمایت کیسے کی؟ ہم ہر اس قدر کے علمبردار ہیں۔ جن پر برطانیہ ایمان رکھتا ہے مثلاً جمہوریت ''لبرل ازم'' غیر جانبداری' پاکستان تو ایک فرسودہ ''تھیا کرسی'' ہے۔ کنگز لے مارٹن' تایا زنکن' ایٹلی' میلکم میگرج' کیطلے' گرگس ہیوشنکر جیسی نمایاں شخصیتوں کے مباحثے ہوئے جن میں ہمیشہ فیصلہ پاکستان کے حق میں ہوا۔

کامن ویلتھ سوسائٹی کی مجلس میں ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس میں پاکستان کے تین سابقہ انگریز گورنر' کمشنر اور افسران تھے۔ پاکستانی خصوصاً طلباء قومی جوش سے پھنپنا رہے تھے۔ لندن کے مسلمانوں نے حسین دریا دلی سے چندہ دیا اور جن جذبات کا اظہار کیا۔ وہ ناقابل فراموش ہے۔ طلباء کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے تعلیمی پنجروں کو توڑ کر اپنی سرزمین پر پہنچیں۔ شیروں کی طرح ٹہلتے اور غراتے تھے لیکن بے بس تھے۔ مسلمان ہوٹل والوں نے اپنی حب الوطنی کا ثبوت طعامی قسم کا دیا۔ انڈین کڑھی پر یوں X نشان لگا دیا۔ مجھے اس زمانے میں نہ کھانا ہضم ہوتا نہ دودھ۔ دماغ میں تشنج اعصابی ڈھیر ہو گیا۔ بار بار یہی سماں آنکھوں کے سامنے آتا کہ خدا نہ کرے اگر ہمارے لاہور کو کچھ ہو گیا تو لارنس گارڈن میں سکھ اپنی زلفیں کھول کر کڑاہ پرشاد کھا رہے ہوں گے۔ اس وقت دوست

KitaabPoint.blogspot.com

رشتہ درست کر صرف ایک نقطہ بن گئے تھے۔ وہ تھا لاہور۔ وہ چلا گیا تو پھر ماتم کس کا کریں گے؟ روز صبح اندھیرے سے چار بجے بلالی صاحب کی چیخنے کی آواز آتی تھی۔ ٹیلیفون پر پنڈی سے تازہ ترین احکامات صادر ہوتے تھے۔ میری سہیلی کا یہ سب خبریں سن کر پیٹ پھولتا تھا۔ فوراً میرے کمرے میں آ کر بتاتی تھی۔ اب یہ ہوا' اب وہ ہوا۔ وہاں مات دی وہاں مات کھائی۔ بلالی صاحب چوکھی لڑ رہے تھے۔ ایک طرف چھوٹے بڑے پاکستانیوں کی خاطر مدارات' دوسری طرف لندن کے طلباء کو پچکارنا' سمجھانا (وہ سب فائر بندی کے خلاف تھے) ادھر انگریز صحافیوں کو مدعو کرنا۔ اپنا مسئلہ سمجھانا۔ پھر سارے سفارتی فرائض انجام دینے۔ مختلف ہالوں میں تقریر کرنی۔ بیچارے کی حالت قابل رحم تھی۔

یہ لندن جو میرا جذباتی جنون تھا۔ اس لندن میں کچھ کرنے کو دل نہ چاہے۔ صرف ہائیڈ پارک کے گھنے درختوں کے نیچے بیٹھ جاؤں اور سوچوں کہ اللہ یہ جنگی اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ ریاض صاحب پنڈی جا چکے تھے اور میں امریکہ سے بچیوں کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ جب فائر بندی ہوئی تو نہ رو سکوں' نہ ہنس سکوں۔ صرف خدا سے دعا مانگی کہ یا اللہ جو بھی ہو' بہتری ہو۔ ذرا اعصابی تناؤ ڈھیلا ہوا تو مسز بلالی کے مہمان سب رخصت ہوئے۔ اوسان ٹھکانے آئے تو میں نے کہا کہ اب ذرا لندن سے مل تو لوں۔ پچھلی کسر نکالنی تھی۔ جی بھر کر یورپ کی درجن بھر کلاسیکی فلمیں دیکھیں' تھیٹر دیکھے' چیخوف کے ڈرامے میں انگرڈ برگمن کو اسٹیج پر دیکھا۔ کم بخت پچاس کی تھی۔ پھر بھی اس طرح پر شباب کہ تھیٹری خوردبین لگا کر دیکھنے پر بھی ایک جھری یا حلقہ نظر نہیں آتا۔ کیا شخصیت ہے! کیا اداکاری ہے! ایک ہر دلعزیز سیاسی ہجو دیکھا جو کئی سال سے چل رہا ہے۔ یہ صرف آکسفورڈ کے چار طلباء پیش کرتے ہیں۔ اس میں برطانیہ کے ہر متبرک ادارے کا خاکہ اڑایا ہے۔ وہاں کے ریلوے' کرکٹ' جنگ' دولت مشترکہ وزیراعظم' نیٹو' جمہوریت' حتیٰ کہ ان کے دو معبود ملکہ اور شیکسپیئر کا بھی۔ ہنستے ہنستے دوہرے ہو گئے۔ یہ ابھی تک چل رہا ہے۔ ہر نئی وزارت کے ساتھ نام بدلتے جاتے ہیں۔ میری قسمت سے اس زمانے میں دولت مشترکہ کا جشن ''کامن ویلتھ آرٹس فیسٹول'' بھی شروع ہو گیا۔ ہر ملک اپنے فنون اور ترقی کی نمائش کر رہا تھا۔ ہمارے خٹک رقاص اور نزاکت علی سلامت علی نہ پہنچ سکے۔ آخر الذکر کی غیر حاضری پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہمارے کلاسیکی گویے مغرب میں نہیں چلتے۔ وہاں ان کے تان پلٹے صرف موتی نٹ بازی یا جمناسٹک معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ ستار اور سرود رنگ جما لیتا ہے' گلا نہیں۔ افریقہ سے نہایت دلچسپ ٹیمیں آئی ہوئی تھیں۔ ''سی ایرالیون'' کی عریاں تنومند خواتین تین چوتھائی بینڈ کی ناظم تھیں۔ ان کی کوئی رقاصہ پندرہ سال سے اوپر نہیں تھی۔ ان کی چکنی چکنی برہنہ آبنوسی جلد ہال میں چمک رہی تھی اور بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ اس مکمل عریانی پر انگریز ناظرین نے پلک بھی نہیں جھپکائی۔ ملکہ بھی بمعہ اپنے دربار کے مزے لیتی رہی۔ ''ویسٹ

KitaabPoint.blogspot.com

انڈیز کا ''لم بو'' (Limbo) رقص ایک کرشمہ تھا۔ چھریرے بدن کا حبشی دونوں کاندھوں پر شمع جلا کر ناچتے ناچتے دس انچ زمین سے اونچے رسے کے نیچے سے نکل جاتا تھا۔ جسم تھا کہ حریز جدھر مرضی مٹھی میں دبا لو۔ لنکا کے تمام جھامی رقاص بھی تھے' جنھوں نے ''ہاتھی ناچ'' پیش کیا۔ محض بوگس! پاکستان ہندوستان کی صنعتوں کے اسٹال بالکل ساتھ ساتھ تھے۔ پہلے ملکہ اور ان کا ''لمبا اور یونگا'' شوہر ہمارے اسٹال پر آئے۔ سب ان کو چیزیں بتائیں دکھائیں۔ جب ہندوستانی اسٹال کی طرف بڑھے تو ڈیوک مڑ کر پوچھتا ہے۔ ''اجازت ہے فائر بندی کی حد پار کرنے کی۔''

ایک دن شام میں نے صرف دولت مشترکہ کے مصوروں اور ان کے فن کے ساتھ گزاری۔ وہاں شہزادی مارگریٹ سے ملاقات ہوئی۔ فوٹو سے کہیں زیادہ خوبصورت بوٹا سا قد' ہلکی گلابی جلد' بڑی آسمانی آنکھیں جن میں فانوس چمک رہے تھے۔ مجھے بہت پسند آئی۔ ملکہ کی بہن نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ یوں احساس ہوتا تھا کہ ان کی والدہ محترمہ نے یورپ کی سیر لمبی کی ہے۔ انگلستان میں عورت یا تو بالکل سفید ہے یا اتنی سرخ کہ لگتا ہے خون پھٹ گیا۔ دنیا میں دو ہی رقص روحانی ہیں۔ ایک مغربی بیلے' دوسرا بھارت ناتیم۔ اس ہفتے یامنی کرشنا مورتی کا بھی پروگرام تھا۔ جب پہنچی تو بتیاں مدھم ہو رہی تھیں۔ اسٹیج پر یامنی کا مدراسی گرو انگریزی میں تقریر کرنے لگا۔ ''ہم ہندوستانی حسن' شاعری' انصاف' امن کے پجاری ہیں۔ کالی داس نے کہا ہے کہ ہمالہ ہندوستان کا جامد قہقہہ ہے۔'' پیچھے اندھیرے سے آواز آئی۔ ''جلد ہی چین اس کو پگھلا دے گا۔'' سب بے ساختہ ہنس دیے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

میکسیکو

ہالی وڈ کی رسی دراز ہو کہ جس نے ''کارمین میرینڈا'' کو نیم برہنہ لباس پہنایا اور بالوں میں کیلئے انگور لٹکا کر ''چاچا بوم چک'' نچایا۔ بچپن میں ہم نے سمجھا کہ یہی لاطینی امریکہ کی نمائندہ ہوگی۔ پھر جوانی میں ٹائم میگزین پڑھی تو خیال کیا کہ یہی لاطینی امریکہ وہ خطہ ہے جہاں سیاسی عہد مختصر اور دوپہر کی نیند دراز ہوتی ہے۔ بہر حال یہ برِ عظیم ہمیشہ سے ایک آرزو تھی۔ لیکن جب موقع ملا تو اتنی عقل آئی کہ یہ ''برا'' جتنا کشادہ ہے ہمارا بٹوہ اتنا ہی تنگ ہے۔ اس لیے قرعہ ڈالنا ہوگا کہ کس ملک کو دیکھیں۔ پرچی نکلی ''میکسیکو'' کے نام کی۔ (ہمارا جغرافیہ ہمیشہ سے کمزور تھا) نقشہ اٹھایا تو معلوم ہوا کہ میکسیکو تو وہیں تھا جہاں ہم بیٹھے تھے۔ ہم شیخ چلی نہیں ہیں۔ ذرا سمجھنے کی بات ہے۔ ہم اس وقت ''کیلیفورنیا'' میں تھے اور پچھلی صدی میں یہ میکسیکو کا حصہ تھا۔ لیکن شمالی ٹیکساس کے لٹیرے سپاہیوں نے نہ صرف کیلیفورنیا کو بلکہ جنوبی ٹیکساز اور ''ایری زونا'' کو بھی دھاندلی میں چھین لیا۔ میکسیکی تا قیامت امریکہ کو یہ ڈاکہ معاف نہیں کر سکتے۔ ان کا نقشہ ایک تہائی سمٹ کر چھوٹا ہو گیا۔ آج جب وہ ٹیکساز کا تیل اور کیلیفورنیا کے باغات' زراعت اور امارت دیکھتے ہیں تو ان کے سینے پر سانپ لوٹتا ہے۔ افوہ! میں بھی کہاں سے کہاں بھٹک جاتی ہوں۔

غرضیکہ قرعہ میکسیکو کے نام پڑا اور ساری زندگی ہم کو اس قرعے سے شکایت نہیں ہوگی۔ جب نیک امریکن مرتے ہیں تو پیرس جاتے ہیں۔ میں جب مروں تو ایک دفعہ میکسیکو ضرور بھیجی جاؤں۔ بہت کم مقامات کو دوبارہ دیکھنے کی اتنی شدید تمنا ہے۔

ہمارا طیارہ رات کو نو بجے دارالسلطنت ''میکسیکو سٹی'' پر منڈلانا شروع ہوا۔ بتیوں سے اندازہ ہوا کہ شہری نقشہ اگرچہ ترتیب اور دانشگی ہے مگر پھر بھی ایک لٹک مجذوبیت کی بھی ہے۔ ہوائی اڈے سے ہوٹل تک یوں محسوس ہوا کہ مشرقیت قریب آ گئی ہے۔ سیاہ بال' بھوری یا کالی آنکھیں' اکثر گندمی رنگتیں' مانوس بے تکلفی' مانوس بدانتظامی' مانوس لاپرواہی' غسل خانوں میں فنائل اور ٹائلٹ پیپر عموماً غائب۔ اہلکاروں میں کاہلی' فرنیچر پر دھبے اور مٹی۔ باہر نکلو تو جانی پہچانی غربت (لیکن اس غربت کا پھر بھی ہماری غربت سے کوئی مقابلہ نہیں۔ میکسیکو فی کس شرح آمدنی کے لحاظ سے ہم سے بہت آگے ہے)

امریکہ کی امارت اور سرد مہری کے بعد میکسیکو اور بھی مانوس اور نیم مشرقی معلوم ہوا۔ پھر اس کی فضا۔ زندگی کی رفتار امریکہ سے کس قدر مختلف ہے۔ یہاں سڑکوں پر لوگ چل رہے تھے۔ بھاگ نہیں رہے تھے۔ یہاں کاروں میں قیامت کی بھگدڑ نہیں تھی۔

KitaabPoint.blogspot.com

خوب گھومنے کے بعد شہر کا نقشہ بھی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا۔ یہ شہر جتنا بڑا ہے' اتنا ہی ایک سیاح کے لیے آسان بھی ہے۔ جب تک کوئی مہابدھو نہ ہو یہاں کھو یا نہیں جاتا۔ بہت کم شہروں کی ترتیب میں تاریخ نے اتنا موثر حصہ لیا ہے۔

سات ہزار فٹ کی نیم برفانی بلندی پر حکومت کا یہ مرکز ہمیشہ سے خوش قسمت رہا ہے۔ دنیا کے دارالحکومت کئی بار بنے اور بگڑے۔ ہماری دلی ہی کو دیکھیے کہ بیچاری سات بار اجڑی اور بسی۔ لیکن میکسیکو سٹی کی یہ خوش بختی تھی کہ اسے ہر عہد میں مہذب اور باذوق حکمران ملے۔ جنھوں نے گزشتہ کو منہدم کرنے کی بجائے آئندہ کو آراستہ کیا۔ اس شہر کی تولید حسن پرست اژتک قبائل کے سرداروں کے ہاتھوں میں ہوئی۔ انہوں نے اس کی جھیلوں کے کنارے اپنے محل سرا اور تکونے مندر بنائے۔ اس کے مچلتے پانیوں میں اژتک امراء کے شکارے پھولوں اور طلائی گھنٹیوں سے مسیح ڈولتے رہتے تھے۔ ہسپانوی فاتح کورتے نے اس شہر کو ''نئی دنیا کی وینس'' کا لقب دیا تھا۔

ہسپانوی عہد ہی میں اٹلی' فرانس اور سپین سے مشہور معمار بلائے گئے جنھوں نے اس شہر کو تین صدیوں تک بلند کاخ و کلیسا سے آراستہ کیا۔

انیسویں صدی میں کچھ عرصہ کے لیے فرانسیسی بادشاہ ''میکسی ملین'' بھی انگلی کٹوا کر شہیدوں میں شامل ہو گیا۔ اس کی جامہ زیب ملکہ کو اپنے خاوند سے عشق تھا۔ اس لیے اس نے میکسیکو کی مشہور شاہراہ ''ریفارما'' بنوائی جو سیدھی محل پر جا کر ختم ہوتی ہوتا کہ وہ اپنے مجازی خدا کو دوری ہی سے آتا جاتا دیکھ سکے۔ (ہمیں کچھ شک گزرتا ہے کہ اس کی وجہ شاید کچھ اور ہی ہو۔ رومن امراء اس معاملے میں بیویوں کا بہت پاس رکھتے تھے۔ آنے سے پہلے ہمیشہ ایلچی بھیج کر اپنی بیویوں کو خبردار کر دیتے تھے)

غرضیکہ صدیوں کے استعماری راج کے خلاف قومی جذبہ بھڑکا۔ بہت طویل اور روح فرسا خانہ جنگی کے بعد میکسیکن باشندوں نے بیرونی سامراجیت کا بوریا بستر باندھ کر باہر پھینکا اور ۱۸۲۳ء میں ایک آزاد ری پبلک قائم کی اور حکومت کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔ خاصے عرصے تو باری باری لیڈر آئے۔ صدر بنے۔ اچھا یا برا آئین قائم کیا۔ ۱۹۱۷ء میں آخر ان بدبخت عوام نے ''اصلاحی آئین'' (Reform Constitution) حاصل کیا۔ لیکن پھر بھی مکمل جمہوریت اور مساوات کا سہرا ''کاردناز'' (Cardennas) کی زرعی اصلاحات کے سر رہا' جس نے چالیس فیصد کسانوں کو دوبارہ اراضی کی ملکیت دلوائی۔

پچھلے تیس سال میں میکسیکو نے سیاسی استحکام حاصل کیا تو دارالسلطنت کی قسمت اور بھی چمک اٹھی۔ اپنے ماہر فن کو جو UNESCO کا سابقہ ڈائریکٹر جنرل بھی رہ چکا ہے' وزیر تعمیرات بنایا۔ اس وزیر نے میکسیکو کے آثار قدیمہ کو ایک طرف سہارا دیا

KitaabPoint.blogspot.com

اور جدید تقاضوں پر پورا اترنے والے شہر کی نئی بنیاد ڈالی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میکسیکو کے نصف حصے کی پشت بھاری ہے اور بقیہ مستقبل کا آئینہ دار ہے۔ تاریخ اور جدید تنوع بیک وقت سانس لے رہے ہیں۔

لاطینی امریکہ کی نمایاں فلک بوس عمارت یہاں پر بھی لیکن امریکن "سکائی سکریپر" کی طرح نہ اتنی بلند نہ اتنی یکساں۔ چتر کاری کے چار دیوتاؤں (Sequiros, Gorman, Diego Rivera, Orozco) نے ہر اہم عمارت کے ماتھے پر' بازو پر' قدآدم "میورل" بنائے ہیں۔ ان میں ہزاروں رنگوں کو ترتیب دے کر میکسیکو کی تاریخ کے یادگار مناظر منقش کئے گئے ہیں۔ ان "میورلز" نے میکسیکو سٹی کو دنیا کا سب سے اچھوتا شہر بنا دیا ہے۔ ان کو دیکھ کر عوام جمالیاتی فن سے آشنا اور قومی افتخار سے لبریز ہوتے ہیں۔ تعلیمی وزارت اور مرکزی سیکرٹریٹ کے میورل کیتھولک چرچ کا اعلانیہ ہجو ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح مذہبی مناددوں نے مزدوروں کی ہڈیوں کو پیس کر اپنے اہرام اناساخت کئے تھے اور پھر اس پر سونے کا ملمع کرتے تھے۔ کس طرح وہ عوام کے حقوق بادشاہوں کے ہاتھ نیلا کر کے ان کی قرابت اور خوشنودی حاصل کرتے تھے۔ زیادہ تر میورل انڈین قبائل کی ابتدائی تاریخ ثقافت ہیں۔ بعض ازٹک دور کی رسومات اور فصلی جشن۔ بعض میں سامراجی عہد کے مظالم۔ چند میں آزادی کی جدوجہد اور زندۂ جاوید میکسیکو کی تازہ امنگیں ہیں۔

اگر میکسیکو کے مورخ مٹ بھی جائیں تو یہ میورل ان کے اوراق کی مکمل شہادت ہیں۔ میکسیکو شہر خط استوا کے شمالی قرب میں ہے۔ اس لیے اتنی بلندی کے باوجود اس کو وہ موسم ملا ہے جس کو "ابدی بہار" کہتے ہیں۔ سدا ہری گھاس' ہرے بھرے درخت جو جاڑوں میں بھی اپنے پتے نہیں جھاڑتے۔ اس کی فضا میں عجیب قسم کی دمک اور کرارہ پن ہے۔ یہاں ہر روز ایک ناقابل یقین کرشمہ دیکھنے میں آتا ہے جسے پہلے پہلے تو میں نے نہیں مانا۔ پھر کئی دن دیکھنے کے بعد اس پر ایمان لے آئی۔ وہ یہ کہ مئی سے اکتوبر تک یہاں ہر روز چار بجے کے قریب پھوار پڑتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ٹیلیفون پر 04 سے پوچھ کر عین مقررہ وقت پر آتی ہے اور چھ بجے تک غائب ہو جاتی ہے۔ مجھے کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا۔ کہ بارش کی دیوی بھی ہم مجبور انسانوں کی طرح وقت کی مقید ہو سکتی ہے۔

شہر کا ظاہری شور وشغب جب ذرا ہلکا ہوتا ہے تو اس کا باطن آہستہ آہستہ ابھرتا ہے۔ کسی بھی ملک کے انسان اس کی اصلیت ہوتے ہیں۔ ہوائی اڈے پر یا ہوٹلوں میں جو نمونے نظر آتے ہیں ان کی پلاسٹک کی مسکراہٹیں ہوتی ہیں۔ مصنوعی پلکوں کی طرح جھپاکے میں اترتی چڑھتی رہتی ہیں لیکن سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے' باغوں میں لیٹے ہوئے' زمین دوز مرمتوں میں جتے ہوئے۔ دیہاتوں سے پوٹلے اٹھائے اور بھٹے کھاتے ہوئے' تین تین بچوں کو کندھوں پر اٹھائے گاتے ہوئے جو لوگ دکھائی دیتے ہیں' وہ ہیں کسی شہر کا

KitaabPoint.blogspot.com

باطن۔ میکسیکو کا باطن خوش مزاج نظر آیا۔ یہاں عام لوگ غیر مانوس چہروں خصوصاً عورتوں کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ شرماتے اور سراہتے بھی ہیں۔ بعض وقت سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ مسکرا مسکرا کر مذاق اڑا رہے ہیں یا داد دے رہے ہیں۔ میری ساڑھی سے کچھ زیادہ عجوبہ ان کے لیے بچیوں کی سلوار قمیض تھی۔ کئی جگہ تو ٹھٹھ لگ جاتے تھے اور جب قریب جاؤ تو گردن ڈال نیچی نظر کر کے الگ۔

ہسپانوی خون کے باعث ان میں ''شی ولری'' (Chivalry) نمایاں ہے مگر انڈین قبائلی جھجک اور حجاب بھی شامل ہے۔ دیہاتوں کی بیروزگاری دیہی آبادی کو بڑے شہروں کی طرف دھکیل رہی ہے۔ اس لیے ہر قدم پر آپ کا تھیلہ اٹھانے کے لیے چار مزدور تیار ہیں۔ بھکاری بھی ہیں مگر خاموش۔ آپ کی بوٹیاں نہیں نوچتے۔ اسی لیے اس ملک میں خیرات دینے کو میرا دل چاہتا تھا۔ بوڑھی عورتیں جگہ جگہ لاٹری بیچ رہی ہیں۔ بوڑھے بوٹ پالش کر رہے ہیں۔

عورتوں میں حسن جہاں بھی نظر آئے سمجھ لیجئے یہ ہسپانوی خون کا اثر ہے۔ جہاں چپٹی ناک' چندھی آنکھ یا سپاٹ پیشانی نظر آئے تو سمجھو کہ انڈین رگ پٹھے غالب آگئے ہیں۔ ویسے ''شدھ'' کہیں نہیں ہے۔ ہماری طرح نسلی سلاد ہے۔ کوئی کسی کھیت کی مولی کوئی کسی کھیت کی۔ نہ خالص ہسپانوی نہ خالص انڈین' سب ''میس تیزو'' (Mestizo) ہیں۔ ہماری رگوں میں بھی کہیں ترکی' کہیں تاتاری' کہیں ایرانی' کہیں یونانی' کہیں عربی' کہیں چینی' کہیں دراوڑی' کہیں آریائی خون بہہ رہا ہے۔ ہمارا تجزیہ کرتے کرتے ماہر علم بشر خود سکون حاصل کرنے کے لیے پاگل خانے میں گھس جائے۔

میکسیکی لوگ ایک تو آپ سے ''نہ'' بہت کم کہیں گے۔ یہ جھوٹ کی عادت نہیں ہے محض وہ آپ کا دل نہیں توڑنا چاہتے۔ غلط پتہ بتا سکتے ہیں' لیکن ایسی بدتمیزی نہیں کریں گے کہ کہہ دیں ''مجھے معلوم نہیں'' خاصے ملائم آداب کے مالک ہیں لیکن ان کی یہ شائستگی کم از کم مجھے کانورا کر دیتی تھی۔ پوچھو کچھ بتاتے ہیں کچھ' بہت دھکے کھلوائے۔ وہ تو شکر تھا کہ ٹیکسی کچھ سستی تھی ورنہ قیامت آہی جاتی۔

میں چٹوری نہیں ہوں لیکن امریکہ میں مغربی کھانے کھا کھا کر زبان کچھ ایسی لیس دار ہوئی کہ مجھے کچالو اور دہی بڑوں کے روزانہ اتنے خواب آئے کہ تکیہ گیلا ہو جاتا۔ میکسیکو پہنچتے ہی پہلی رات گیارہ بجے ایک ریستوران پہنچی۔ جیسے ہی سامنے میری نظر ہری مرچ' ٹماٹر' پودینے کی چٹنی پر پڑی' جو بلک کر گری تو جب تک پورا کھانا میز پر آتا' زبان سن ہو چکی تھی۔ یہاں کی مرچیں تتیا ہوتی ہیں۔ سب پچھلے قرضے پورے ہو گئے۔

ان کا ''تورتا'' ایک بے ہنگم لفظ ہے۔ جس میں بہت سی چیزیں سما جاتی ہیں۔ یہ اصل میں چھوٹے سخت پھلکے کی طرح ہوتا ہے اور پکایا بھی توے پر جاتا ہے لیکن میدے کا ہوتا ہے اس لیے ثقیل ہوتا ہے۔ یہ تورتے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ چاہے آپ چپاتی کی طرح

KitaabPoint.blogspot.com

کھائیں چاہے ان کے سموسے بنوالیں' چاہے سنوچ۔ اس میں مرکب بھی ہزار قسم کے بھرے جاتے ہیں۔ کوئی میٹھا' کوئی نمکین' کوئی کھٹا۔ عموماً گوشت یا سبزی بھری جاتی ہے۔ وقت پڑنے پر اس تورتے کی پلیٹ بھی بن جاتی ہے اور ٹیکن نہ ہو تو اس کا کام بھی دے جاتا ہے۔ یہ ان کا بنیادی کھانا ہے۔ اس کے بعد اپنا اپنا مقدر۔ بعض کو یہ بھی میسر نہیں تو چنے چبا لیتے ہیں۔ اور جوں جوں ریستوران مہنگا ہوتا جائے اور دام اور اقسام بڑھتی جاتی ہیں ''چیلا کیل'' اور ''این چلاوا'' مجھے تو کھانے میں یوں معلوم ہوئے کہ گاڑھے قورمے میں سموسے چبا رہے ہیں۔ یہ خالص میکسیکی چیزیں ہیں۔ لیکن مجھے تو بالکل نہیں بھائیں۔ ایک دو جگہ لوگوں کو گلابی چٹنی کے ساتھ کینچوے کھاتے دیکھا۔

پچھلے جنم میں میکسیکی قطعی جل مانس ہوں گے کیونکہ ان کو سمندری جانور بہت پسند ہیں۔ ہر کچھوے اور کیکڑے پر ان کی رال ٹپکتی ہے۔ ان کی چاول کی شراب پلک چینیوں کی ''موت آئی'' سے ٹکر لیتی ہے۔ دونوں ظالم ہیں۔ روسیوں کی طرح یہ قوم بھی ہری پیلی لیمونیڈ خوب ڈگ ڈگا کر چڑھاتی ہے۔

ایک چیز جو محسوس کی وہ یہ کہ ان لوگوں کے کانوں کے پردے بہت مضبوط ہیں۔ کوئی شور برا نہیں لگتا۔ کھانا بھی کھائیں گے تو آرکسٹرا ٹیپ کے سروں میں بجے گا کہ گفتگو تو کیا حلق کے بھی پردے بند ہو جائیں۔ مجھ سے زیادہ شور میں کھانا بھی نہیں کھایا جاتا۔ پھر کھانے کے ساتھ ہی ساتھ جوا بھی چل رہا ہے۔ لوگ بازیاں لگا رہے ہیں۔ کہیں لڑائی ہو رہی ہے۔ کہیں فلک شگاف قہقہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ لیکن یہ مخصوص میکسیکی ریستوران ہیں۔ بڑے ہوٹل تو سارے جہان کے ایک ہی جیسے ہیں۔ ہلٹن' انٹرکونٹی نینٹل سب جڑواں معلوم ہوتے ہیں۔ چاہے فلورنس ہو یا برازیلیا یا پنڈی اندر بدستور یکساں فضا۔ جب تک ہوٹل سے باہر قدم نہ رکھو۔ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس ملک میں بیٹھے ہیں۔

ایک شام ان کے ایک ''گیتانیریا'' (Guitanaria) میں گئے۔ ایک ننھا تاریک غار جہاں شمعیں جل رہی تھیں۔ جھنڈیاں' بیلون لٹکے ہوئے' شراب کی بوتلیں خالی اوندھی' سگریٹ کے دھوئیں سے سارا ماحول دھندلایا ہوا۔ آدھی شکلیں مدھم مدھم' گیتار پر نوا سرا۔ ہسپانوی دھن میں ہجر و محبت کی تشریح کر رہا تھا۔ رقاصہ اپنا تن اکڑائے۔ سانس روکے مورنی کی طرح لباس کے پر پھیلائے فرش پر ہیلوں سے تھاپ دے رہی ہے اور مٹھیوں سے ''کسٹانٹ'' کے تال بھی یہاں سے دل نہ چاہے اٹھنے کو عجیب سماں تھا۔ اتنے میں ایک میکسیکی منچلا میرے پاس آن کر شراب آلود سانس میں کچھ بولا۔ جس کا آدھا مفہوم سمجھ میں آیا اور میں نے بچیوں کے بازو پکڑے اور دم دبا کر بھاگی۔

KitaabPoint.blogspot.com

میکسیکو میں ایک چیز قابل دید ہے' وہ ہے "بیلے فوک لوریکو"......

چونکہ سامراجی ایام میں لوک گیت آہستہ آہستہ طاق نسیاں کی نذر ہو رہے تھے۔ اس لیے پچھلے ۳۵ برسوں میں لوک معاشرے کو بہت سرعت سے دوبارہ زندہ کیا گیا ہے۔ یہ بیلے اسی کوشش کی نمایاں پیشکش ہے۔ اس میں دو سو رقاص اور مغنیوں نے دیہاتی انڈین طریق حیات پر کلاسیکی انگ میں "اوپیرا" مرتب کیا ہے۔ اس میں آپ تا لسر میں اچھی خاصی تعلیم حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسی رسومات مذہبی توہمات اور سماجی تعلقات سب رقص کی صورت میں بتائے گئے ہیں۔ صرف ایک نصیحت ہے کہ میری طرح سستے ٹکٹ لینے کی حماقت نہ کریں۔ اتنی اونچی سیٹ ملے گی کہ نیچے اسٹیج پر نظر پہنچتے پہنچتے خاصا وقت لے لے گی' وہ بھی اگر چکرا نہ گئی۔

میں عموماً ٹکٹ کے معاملے میں کنجوسی نہیں کرتی مگر یہاں چونکہ پورا خاندان تھا اس لیے کفایت شعاری کا شوق چرایا۔

جہاں یہ مشہور بیلے منعقد ہوتا ہے وہ بھی قابل تحسین عمارت ہے۔ اسے فنون لطیفہ کا محل کہتے ہیں۔ یہ میکسیکو کے شاندار اداروں میں سے ایک ہے۔ سنگ مرمر کا یہ محل ثقافتی نشستوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ لیکن اس کی زیر سطح زمین اسپنج کی طرح نرم ہے۔

یہاں کے وردی والے گائیڈ نے ہنس کر ڈرایا کہ یہ گزشتہ برسوں میں آہستہ آہستہ بارہ فٹ نیچے دھنس چکا ہے۔ کئی جگہ جہاں سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ اب وہ نیچے جا رہی ہیں۔ گائیڈ بولا "ڈریئے مت' اب یہ مزید نہیں دھنسے گا۔" ہم نے سوچا کہ اپنی چار چھ تا نک جان ہے' کیا فرق پڑے گا۔

ایک چیز سے میکسیکو میں کہیں مفر نہیں اور وہ ہے' میورل۔ اس قصر فنون میں بھی دیوار تا دیوار پر شکوہ میورل بنے ہوئے ہیں۔ اس کے اسٹیج کا پردہ شیشے کا ہے جو آہستہ آہستہ نیچے گرتا ہے جس کی مصوری پر پوشیدہ بجلیاں مرتکز ہیں۔ صرف یہ پردہ دیکھنے کے لیے ہی مخلوق ٹوٹی پڑتی ہے۔

میکسیکو کا سب سے بڑا لطف اس کے بازار ہیں لیکن دور "اندرون شہر" کے بازار بالکل ہماری طرح بے ترتیب اور غیر محفوظ۔ غلیظ لیکن ہمارے بازاروں سے پھر بھی بہتر۔ انسان جانور سب ایک ہی سڑک پر چل رہے ہیں۔ کوئی گدھا گاڑی سے منڈی سے سبزی لا رہا ہے کوئی خچر پر کمہار پورا کھیپ' وہی ریڑھیوں پر۔ برتن' کھلونے' وہی جھک جھک اور چکانا۔ چکانے میں میکسیکی بھی بڑے ڈھیٹ ہوتے ہیں۔ شروع کہاں سے کرتے ہیں اور ختم کہاں پر۔ ہماری طرح ان بازاروں کی وہی خوشبوئیں۔ وہ آوازے' آپ قدم پھونک پھونک کر رکھئے۔ ایک طرف میلے بنیانوں میں نم نم شیر خوار منہ بسور رہے ہیں۔ ایک طرف مرچوں کے ڈھیر۔ کسی جڑی بوٹیاں' کہیں لکھا ہے "سینی توریو" ہم سمجھے کوئی مقامی سینی ٹوریم ہوگا۔ معلوم ہوا کہ حمام کو "سینی توریو" (Sanitorio) کہتے ہیں۔ ہمارے

KitaabPoint.blogspot.com

میاں چار آنے دے کر اندر گئے تو بجائے تولیے کے ڈھائی گز کاغذ ملا۔ فوراً واپس آ گئے۔ آگے بڑھے تو سڑک کے نکڑ پر ایک کالے شال Rebozo میں ایک معمر چیچک کے داغوں والی بڑھیا کھڑی مجرب نسخے اور جڑی بوٹیاں بیچ رہی تھی۔ اس قسم کے نیم حکیموں کو میکسیکو میں "کیورین دارو" (Curan Deros) کہتے ہیں۔

خیر یہ تو پرانی وضع کے بازار تھے لیکن جدید میکسیکو نے بھی سوپر مارکیٹ بنائے ہیں۔ یہاں خرید فروخت کی دنیا پستہ بادام سے لے کر واشنگ مشین تک سیلوفین میں ملبوس ہے۔

میکسیکو کی دستکاریاں اس کے لیے زرمبادلہ کمانے کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو حکومت نے کئی کارخانے اور دکانیں خود سنبھال لی ہیں جہاں سیاح بے خوف وخطر چیزیں خریدتے ہیں۔ وہاں نہ سونے چاندی میں کھوٹ نہ کسی چیز کی ساخت کمزور۔ دوسرے یہ کہ میکسیکو کے اندرونی علاقوں میں رواجی دستکاریوں کا ایک چشمہ ابل رہا ہے اور امڈ امڈ کر بڑے شہروں کے بازاروں میں بہہ رہا ہے۔ حکومت اپنے ثقافتی ورثے پر ناگ کی طرح نظر رکھتی ہے۔

صدیوں سے رنگ اور نقش اور کاریگری کے جو راز سینہ بہ سینہ چلے آ رہے ہیں انہیں برقرار رکھتے ہوئے ان کا سمبندھ جدید تقاضوں سے جوڑ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سیاح ٹوٹا پڑتا ہے۔ میں تو دنگ کیا پاگل ہو گئی۔ عقل کچھ کام نہ کرتی تھی کہ کیا خریدوں اور کیا نہ لے جاؤں۔ کاش پاکستان قریب ہوتا تو میکسیکو کے دستی ورثے ٹرک بھر کر خریدتی اور پاکستان روانہ کرتی۔ ہوائی سفر میں کیا خریدا جا سکتا ہے؟ آبی جہاز سے چیزیں بھیج کر کم از کم میرے تجربے خوشگوار نہیں رہے۔ چیزیں ٹوٹیں تو کوئی انشورنس کمپنی دام نہیں بھرتی اور اگر روپے دے بھی دے تو چیزیں تو واپس نہیں ملتیں۔

ویسے تو اس موضوع پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے اور مجھے تو اس موضوع سے یوں بھی عشق ہے۔ برسوں سے اس پر ریسرچ کر رہی ہوں۔ قصہ کوتاہ اس کی مایہ ناز دستکاریوں میں سے چند ایک کا ذکر لازم ہے۔

میکسیکو کو دنیا کا "رودکش سیم" (Silver Funnel) کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی کانیں سب سے زیادہ چاندی اگلتی ہیں اور مخصوص دکانوں پر اسی چاندی کے سامان پر حکومت کی چھاپ ہوتی ہے۔ گارنٹی تو ایک طرف اس میں سیم کاروں کے گر اور شاہکار دیکھنے۔ ہمارے کشمیری کام کی طرح نازک اور نفیس منبت کاری! کٹاؤ کا کام مینا کی گلکاریاں، نیم بہا پتھروں سے مرصع گلدان، لیمپ جدید "ڈینش" ڈیزائن کے ڈنر سیٹ، پرانے انگلش "شیف فیلڈ" وضع کی موٹے پیٹ کی کیتلیاں۔ نہایت حسین کالے سینگوں یا چوبی دستے والی کٹلری۔ اگر میرے پاس فالتو ڈالر ہوتے تو تانبے کے دمکتے ہوئے "انڈین ماسک" خریدتی جو قبائلی سرداروں کی نہایت

KitaabPoint.blogspot.com

وجیہہ شکلیں تھیں۔

ایک چیز جو میکسیکو نے ایجاد کی ہے اور جو بالکل ان کی اختراع ہے' وہ ہے "پیوندی دھاتیں" (Married Metals) پیتل اور چاندی کا "اوکسی ڈائزڈ" دھات کے ساتھ یہ امتزاج سیاحوں کے لیے ایک نئی ترغیب بن گیا ہے۔ ہر نمائشی اور افادی شے ان پیوندی دھاتوں میں لے لیجیے۔ سیپ کی جڑائی بقیہ ممالک میں ایک معدوم ماضی ہے میکسیکو نے اس فن کو بھی ازسرنو پروان چڑھایا۔ ہزاروں لوازمات صدف صد رنگ سے مرصع!

میرا تو ایک "الو" پر دل آ گیا۔ ڈیڑھ فٹ لمبا' بال و پر سیپ کے۔ آنکھیں بھی ہری چمکتی ہوئی۔ لیکن اس کی قیمت ایک سوڈالر سن کر عشق رفو چکر ہو گیا۔ ویسے یہ جانور جو ہمارے ہاں گالی ہے لاطینی امریکہ میں لوک دیوتا ہے۔ ہر ذریعہ اور Medium نے اس کی نقل کی ہے۔ مٹی میں تو اس قدر شاندار اور وجیہہ الو ملتے ہیں کہ کس کو گلے لگاؤ اور کس کو پھول چڑھاؤ۔ دو جانوروں کو دیکھ کر میری ممتا ابل پڑی۔ وہ ہیں گدھا اور الو۔ اتفاق سے دونوں ہمارے ہاں دشنام ہیں۔ واللہ اعلم کیوں؟

اس ملک نے چمڑے کی صنعت کو بھی بے مثال ترقی دی ہے۔ روز مرہ کی ہر ضرورت طرح طرح کے چمڑوں نے پوری کی ہے۔ کوئی سانپ کی کینچلی کوئی گرگٹ کی' کوئی مگرمچھ کی کھال' کوئی چیتے کی' کوئی لومڑی' کوئی زیبرا' کوئی ہرن غرضیکہ انسان کی نمائش اور مانگ کے لیے پورا چڑیا خانہ آباد ہے۔ ظروف گل Ceramics پر تو ایک الگ عنوان درکار ہے۔ شمال سے جنوب تک میکسیکو کا ہر شہر اپنی خصوصی روایات۔ خصوصی راز تشکیل۔ خصوصی رنگ و زیبائش کے لیے معروف ہے۔ "میتی پیک" کے گلی حیوان خریدیے۔ "اوکساکا" کی مشہور سیاہ پوٹری لیجیے۔ "پیوبلا" کے مضحکہ خیز گلی دیوتا کیتلیوں کی شکل میں خریدیے۔ جن کی توند بٹنے کی طرح' ٹونٹی مسخرے کی ناک کی طرح دس انچ باہر نکلی ہوئی۔

وہاں کی کشیدہ کاری جتنی باریک ہے' اتنی ہی سستی بھی ہے۔ "وی پل" گلے میں ڈالنے کا ایک گول کڑھا ہوا شال میں نے پانچ روپے کا خریدا۔ وہاں کی دریاں بھی جنہیں "سراپ" کہتے ہیں' ہماری طرح بنی جاتی ہیں۔ تقریباً وہی رنگ وہی نمونے وہی سواسٹکا' وہی لوازمات جو ہمارے ہر قریہ' ہر گاؤں' ہر بساطی کے ہاں لٹکی ہوئی ہیں۔ غرضیکہ میکسیکو نے چین' جاپان' ہندوستان اور "اسکنڈے نیویا" کے ساتھ ساتھ ثابت کر دیا کہ دستی ہنر محض ماضی کا ایک رومانی جذبہ نہیں بلکہ کسی بھی جدید ملک کی رگ اقتصادیات بن سکتے ہیں۔ دستکاریاں اور میکانکی عہد کوئی دو متضاد دشمن نہیں بلکہ دونوں ہی باہمی بقا کے اصول پر ترقی پا سکتے ہیں۔

میکسیکو لاکھوں سیاحوں اور بے شمار پرستاروں کے لاڈ کے باوجود نہیں بگڑا۔ ماسوائے دو چار بڑے شہروں کے بلند اور مہنگے

KitaabPoint.blogspot.com

ہوٹلوں کے عموماً زندگی اور اس کی ضروریات مقابلتاً امریکہ اور یورپ سے بہت سستی ہیں۔ رہائش معقول' ٹیکسی جاپان کی طرح سستی اور بہت تیز۔ بخشیش بھی کم' ایک یا دو روپے سے سب خوش۔ کھانا آٹھ آنے سے لے کر ۸۰ روپے تک' جو آپ کا بٹوہ اجازت دے۔ تفریحات خاصی سستی' خرید و فروخت سوائے ہیم وسیپ کے بہت ہلکے داموں کی۔ ایک سیاح کو اور کیا چاہیے!''

کچھ تھوڑے سے تجربے کے بعد میرا تو یہ کہنا ہے کہ مہنگے سے مہنگے شہر میں بھی سستے سے سستا ٹھکانا مل سکتا ہے۔ بشرطیکہ آپ نخرے پیٹے نہ ہوں۔ فرانس ہے تو حسین لیکن بدنام (مہنگائی کے تناسب سے ''بدنام'' زیادہ موزوں ہے) نیس (Nice) میں بھی ہمیں ۲۵ روپے یومیہ پر دو پلنگ کا کمرہ اور صبح کا ناشتہ مل گیا تھا۔ بھئی پلنگ کی چادر صاف ہو اور ستھرا غسل خانہ ہو تو بہت ہے۔ اگر ناشتے پر صرف سیاہ کافی اور سوکھے رسک ملے تو کوئی مضائقہ نہیں' آپ باہر جا کر دوبارہ ناشتہ کر لیجیے۔ لیکن صرف رات گزارنے کے لیے تکلفات کی کیا ضرورت ہے۔

ایک سیاح سارے دن کا تھکا ہارا بارہ ایک بجے رات کو بے غل وغش سو جاتا ہے اور صبح چائے پی کر پھر روانہ۔ اسے کہاں فرصت کہ کمرے میں اعلیٰ قالین کی موٹائی ناپتا پھرے یا ٹی وی دیکھے یا ان حسین تولیوں کی قطار سے باری باری منہ پونچھے۔ ان چھوٹی چھوٹی آسائشوں سے آپ کی حجامت بنتی ہے اور روپے حرام میں جاتے ہیں۔ میں تو اپنے میاں سے ہر دفعہ اس بات پر لڑی۔ کبھی ہاری کبھی جیتی۔

میکسیکو میں بھی شروع کے تین دن تو ایک اے کلاس ہوٹل میں گزارے۔ پھر میں نے چپکے چپکے تفتیش کی۔ معلوم ہوا کہ اس فیشن زدہ علاقے سے چار میل دور ایک اصل نسل کا میکسیکی ''پین سیون'' تھا۔ اس لفظ سے قارئین یہ نہ خیال کریں کہ پنشن یافتہ لوگ وہاں رہتے ہیں۔ یہ اطالوی لفظ ہے جس کے معنی ہیں چھوٹا سا ذاتی گھر جسے ہوٹل بنا دیا گیا ہو۔

اس میں ایک آزادی' بے تکلفی اور انسانیت کی تنخیر ہوتی ہے۔ ان سر بفلک شگاف شیش محلوں کی طرح نہیں جہاں انسان اگر دس روپے بیرے کو انعام نہ دے تو وہ ناک چڑھا کر پیٹھ موڑ لے۔

خیر میں تمام خاندان کو کچھ پیار اور کچھ منت سماجت کر کے وہاں لے گئی۔ بچے کہتے' ساری کنجوسی یہیں رہ گئی ہے۔ میں نے داؤں کھیلا کہ بڑے ہوٹل تو بالکل امریکی یا یورپی ہیں۔ اصلی میکسیکو دیکھنا ہے تو اس کے باشندوں کے ساتھ رہو۔ غرضیکہ ہم سوٹ کیس پھر باندھ کر (نفرت ہو جاتی ہے صندوق کھولتے بند کرتے) کیسا گونزالیز (Cassa Gonazales) پہنچ گئے۔ ہمارا بہت پرجوش اور مخلصانہ خیر مقدم ہوا۔ وہاں کا مالک ''سینور ہورہے'' (Siegneur Jorje) ایک نیم گنجا کنوارا تھا۔ جو اپنی معمر اماں اور تین

KitaabPoint.blogspot.com

خوبرو ہسپانوی خادماؤں کے ساتھ یہ ''چین سیون'' چلا رہا تھا۔ جس کے دو حصوں میں چھ سات سیاح خاندان مقیم تھے' جو ہر صبح ناشتے پر یکجا ہوتے تھے اور اپنے اپنے کارنامے تجربے سنا کر دن کا پروگرام بناتے تھے۔ ان ''سی نیوز'' کی بہت خواہش تھی کہ ہم رات کو بھی اس بین الاقوامی کارنیول میں شامل ہو کر کھانا کھائیں۔ لیکن ہمارے کھانے زیادہ تر باہر ہوتے تھے۔ اس لیے وہ ہم سے کچھ رنجیدہ سے ہو گئے۔ ویسے بہت شائستہ آداب نرم و لہجے کے انسان تھے۔ ان کی رگوں میں ''شی ولری'' کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ہر روز ایک نئی سہیلی کے ساتھ رات کو چہل قدمی کے لیے نکلتے تھے۔ ان کی ہسپانوی گوری گوری خادمائیں' سیاہ لباس اور سفید کروشیے کی ٹوپیاں بہت پیاری معلوم ہوتی تھیں۔ ہمارے میاں کی تو ساری شکایات رفع ہو گئیں۔ انہیں دیکھ کر وہ پرانے آہنی پلنگوں کی چرچراہٹ' غسل خانے کی قدامت سب بھول گئے۔ یہ کنیزیں کمروں کو آئینے کی طرح صاف رکھتی تھیں اور صبح ناشتے پر ان کے شاداب چہرے دیکھ کر بھوک کھلتی تھی۔ مجھے حسرت اور ارمان ہے کہ کبھی میں بھی ایسی کامنی اور خوبرو لڑکیاں اپنے گھر میں رکھوں۔

لندن اور پیرس کی پارکوں میں آوارہ گردی کے بعد اگر کہیں مزا آیا تو میکسیکو میں ویسے تو گننے پر آؤ تو اسی شہر میں متعدد باغ ہیں لیکن ان میں ''چپل تو پیک پارک'' عوام کو بہت محبوب ہے کیونکہ اسی نام کے قلعے اور محل کے اردگرد ہے جو فرانسیسی عہد کی یادوں میں چنے ہوئے ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے فرنیچر' بلور' جواہر! سامراجی عہد کی عیاش یادوں کے یہ مقبرے اب آزادی کے بعد عجائب گھر بنا دیئے گئے ہیں۔ ہر کمرے میں دیواروں پر حکمرانوں کے قد آدم مرقعے! کہیں خوفناک مونچھیں' کہیں مصنوعی وگز (Wigs) کہیں شاہانہ توندیں .... بعض کی شکل پر بدہضمی کے نمایاں آثار گویا انہیں میکسیکی غذا راس نہیں آئی۔

تاریخ اور سیاح دوسرے کمروں میں قدم رکھتے ہیں تو اچانک انقلابی آرٹ سے دو چار ہوتے ہیں۔ ایک لیم شحیم میورل ''اوازیز'' کی سرخ فتح کا اور ایک ادھورا میورل مشہور ''سی کوائے روس'' کا ہے۔

یہ غریب مصور ایک طرف تو انقلابی میکسیکو کی سیاسی آن ہے اور دوسری طرف موجودہ معتدل میکسیکو کے حلق میں ایک ہڈی ہے جو پھنس کر رہ گئی ہے۔ ایک عہد نے اس کمیونسٹ جن کو جلوت خانے دیئے کہ اپنے ہنر سے آراستہ کرے۔ دوسرے عہد نے اسے زندان میں دھکیل دیا۔ آج بھی وہ بدبخت تاریکی میں سانس لے رہا ہے۔

خیر! اس محل کی تمکنت اور تاریخ کو چھوڑیئے اور باہر اس کے پارکوں میں تازی ہوا کھایئے۔ کیونکہ حسب معمول برق و بادل کا ڈھائی گھنٹہ کا ڈرامہ روز چار بجے سے شروع ہو جاتا ہے لیکن ذرا دھیمے دھیمے۔ اس لیے آپ برساتی پہن کر اس کی گلابی پھوار میں بھی

KitaabPoint.blogspot.com

گھوم پھر سکتے ہیں۔گلابی اس لیے کہ بادلوں کے اندر ہی اندر شفق بھی پھولتی ہے اور جس نے میکسیکو کی آتش فشاں وادی کی شفق نہیں دیکھی اس نے کبھی فطرت کا لال بھبھوکا چہرہ ہی نہیں دیکھا۔اس پارک کے دیرینہ درختوں کے سبز سایوں میں یہ شفق پتوں میں سے جھلملاتی آتشیں بوندوں کی طرح ٹپک ٹپک کر ہمارے جسم اور کپڑے بھگو دیتی تھی۔میں نے کتنی شامیں یہاں گزاریں۔اور اب بھی اکثر شاموں کو بیٹھے بیٹھے میرے دل میں اک ہوک سی اٹھتی ہے اور وہ پارک یاد آتا ہے۔

پانی پر رواں ایک باغ ''سوچی ملکو'' (Xochi Milco) ہے جو سیاحوں کا مکہ بن گیا ہے۔یہاں ازٹک عہد میں ننھی ننھی کشتیوں کے فرش پر مٹی کی کھاد بچھا کر سبزی اور پھول اگائے جاتے تھے۔جن کی جڑیں پانی میں تیرتی تھیں۔یہ سوچی ملکو آج بھی انگلستان رواں کہلاتا ہے۔اتوار کے دن پھولوں سے لدے شکارے سیاحوں کو دور دور ساکت پانیوں پر سیر کراتے ہیں۔ان ہی کشتیوں میں ریستوران چل رہے ہیں۔چند کشتیوں میں بساطی اپنا مال بیچ رہے ہیں۔کچھ شکاروں میں ہسپانوی آرکسٹرا اپنی دھنیں بجا رہا ہے۔قریب جا کر آپ بھی دو روپیہ دے کر اپنا پسندیدہ نغمہ سنیں۔کسی کشتی میں حسن و جوانی دوش بدوش ہیں۔معاشرے اور کیتھولک مذہب کا اثر کہیے یا انڈین حجاب! یہاں جوانی کو عریاں اور عشق کو بے حیا نہیں پایا۔جو منظر یورپ اور امریکہ کی سڑکوں اور باغوں میں دکھائی دیتے ہیں یہاں نہیں' کمسن لڑکیاں'' فلے منکو'' رقاصہ کا لباس پہنے' کان میں بالے ڈالے اور بالوں میں بھڑکیلی کنگھی لگائے اپنے سرخی غازے کے مکمل احساس کے ساتھ مورتیوں کی طرح ٹھک رہی ہیں۔کہیں مائیں ایک بغل میں بچہ' دوسری میں پکنک لنچ اٹھائے چلی جا رہی ہیں۔کچھ مرد ہرے' گلابی شربت پی کر ٹھٹھے مار رہے ہیں۔ایک طرف بساطی اپنے بازار لگائے بیٹھے ہیں۔ غرضیکہ سیاحوں کو پھانسنے کے اس شہر میں ہزار دام ہیں۔

جب کسی ملک کے عجائب گھر کا ذکر آتا ہے تو مجھے ٹھنڈے پسینے آ جاتے ہیں (اگر مولانا صلاح الدین کی روح بے چین نہ ہو تو میں پھر کہوں گی کہ ہماری زبان میں ابھی اتنی وسعت اور لچک پیدا نہیں ہوئی کہ فنی اصطلاحات سے عہدہ برا ہو سکے۔

خیر صاحب! دنیا میں جہاں بھی گئے عجائب گھر نہیں چھوڑے۔بعض وقت تو میرے بچے بیزار ہو جاتے تھے کہ مجھے ان فنی قبرستانوں میں کیا مزا ملتا ہے۔ماضی وفات پا گیا۔اس کی موروثی یادگاروں کو کیا کرنا؟ میکسیکو میں بھی کئی عجائب گھر دیکھے۔ہر ایک کا ذکر تفصیل سے کروں تو وقت میرا ضائع ہوگا اور مزا شاید صرف ان چند کو آئے جو اس سے شغف رکھتے ہیں۔

''مودرنو میوزیم'' ایک گول سیاہ شیشے کا ''الٹرا ماڈرن'' عجائب گھر ہے جہاں میکسیکو کے چار لافانی مصوروں کی مستقل گیلری ہے۔کئی کمروں میں جدید تجریدی آرٹ کے اوندھے سیدھے فریم ٹنگے ہوئے ہیں۔اس عجائب گھر کی سب سے زیادہ قابل دید چیز

KitaabPoint.blogspot.com

گول چھت ہے جو شفاف سنگ جراحت کی بنی ہوئی ہے۔ اس وقت شام ہو چلی تھی۔ ڈوبتے سورج میں یہ چھت ایک روشن فلک معلوم ہوتی ہوتی تھی۔ دوسرا قابل ذکر عجائب گھر ''فریڈا کاہلو'' کی ذاتی رہائش گاہ تھی۔ یہ مصورہ اپنی ذات سے بھی معروف تھی اور اس وجہ سے بھی کہ وہ ''ڈیگو ریویرا'' کی نیم انڈین سیاہ بالوں والی بیوی تھی۔ اس گھر میں ان دونوں شکاروں نے سالہا سال حب الوطنی کی آگ سے یہ کینوس روشن کئے۔

''فریڈا کاہلو'' کو امریکنوں سے نفرت تھی۔ وہ اپنی مصوری کے ذریعے قوم کو عزت نفس کا پیغام دیتی تھی۔ اس کی تصاویر میں اکثر موت' تاریکی' سنگدلی' کرب و درد نظر آتا ہے۔ لوگ اسے مایوس کن آرٹ کہتے ہیں۔ لیکن مجھے اس عورت سے جاتے ہی ہمدردی ہو گئی۔ عمر کا بیشتر حصہ اس نے اپاہجی (Wheel Chair) میں گزارا اور قوم کی پسماندگی اور نجی تلخیوں کو رنگوں میں بیان کیا۔ آرٹ میں خلوص اور حقیقت ہونی چاہیے۔ چاہے وہ دلربا ہو یا روح فرسا۔

اس گھر میں قومی ہیرو ''ری ویرا'' کی کہیں ٹوپی ٹنگی ہوئی تھی کہیں چھڑی۔ موت انسان کو متبرک بنا دیتی ہے۔ قوم ایک فنکار کو سولی پر لٹکا دیتی ہے اور پھر اسے فوراً شہید کا لقب دے کر اس کے جوتے بھی تاریخی طاقوں پر رکھ دیتی ہے۔

ایک عجائب گھر نہ دیکھنے کا مجھے قلق رہ گیا اور وہ تھا ''ڈیگو ریویرا'' کا ذاتی جمع کردہ ذخیرہ جسے وہ آخری سانس تک بنا رہا تھا۔ یہ اس جنوبی دیو کا اپنا قوم کے لیے آخری تحفہ تھا۔ سنا ہے اس میں خود یافتہ و خود ساختہ تقریباً ساٹھ ہزار مرقعے اور عجوبے ہیں جن میں زیادہ تر قدیم انڈین معاشرے کے شہ پارے ہیں۔

لیکن جس میوزیم کا اب ذکر آنے والا ہے۔ اس کا جواب نہیں۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ دنیا کا سب سے وجیہہ اور شکیل عجائب گھر کونسا ہے تو میں بلا تامل جواب دوں کہ میکسیکو کا میوزیم آف این تھروپالوجی' یہ پہلے صرف میری حقیر رائے تھی لیکن جب پچھلے دنوں یونیسکو کے بین الاقوامی عجائب خانوں کے صدر ملے تو انہوں نے میرے منہ سے لفظ چھین لیے اور مجھے سن کر خوشی اور اطمینان ہوا کہ اتنی بڑی ہستی بھی میری ہم رائے ہیں۔

یہ عجائب گھر حکومت نے قومی احساس و فخر کا کعبہ بنایا ہے۔ اس پر بہترین صناع اور ماہرین نے برسوں کی کاوش کے بعد سنگ مرمر اور سنگ سرخ میں ایک خواب پیش کیا ہے۔ یہ صبح سے رات نو بجے تک کھلا رہتا ہے۔ بہت وسیع اور شاداب باغ پار کر کے پہلے تو آپ اس کے داخلے پر ٹھٹھکئے۔ وہاں پتھر کا دیو پہرہ دے رہا ہے۔ یہ ہے اس کا قدیم دیوتا ''تلالوک'' جب میں یہاں پہلی دفعہ گئی تو وقت غروب آفتاب کا تھا اور یہاں سرخ مٹی کی بیرونی فصیل آتشیں شعاعوں میں تمتما رہی تھی۔ فوارے اور مرمریں دالان پار کر کے

KitaabPoint.blogspot.com

اندر گئی تو بہت بڑے استقبالیہ ہال میں ہر زبان میں حسین گائیڈ لڑکیاں! اسٹالوں پر ہر زبان میں اعلیٰ کتابیں' نقشے' کچھ مشہور پروفیسروں کے مختلف کمروں میں لیکچر ہو رہے تھے۔ اگر آپ یہ بھی سننا چاہیں تو عجائب گھر کے ہر کمرے میں بٹن دبا کر ٹیپ ریکارڈ پر اس عہد کی کہانی سن لیجیے۔ جس سے وہ کمرہ آراستہ ہے لیکن ابھی دل نہیں چاہتا کہ فوراً تاریخ میں چھلانگ لگائی جائے۔ ابھی صرف اندرونی اور بیرونی ساخت سے مرعوب ہوں موزیم کا میورل بنا ہوا ہے۔ میکسیکو میں کسی میورل کی پیمائش بیکار ہے۔ ہر میوزل قیامت کے فتنے کی طرح دراز ہے۔ ایک طرف بلور صد رنگ اور آہنی آبنوس کا میل۔ یہ بھی نئے قسم کا دیوزاد میورل تھا۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ سارے میکسیکو کو "میورل معاشرہ" کہنا چاہیے۔ اندر وسیع دالان میں جائیے تو لمبے لمبے ستون ان پر گلگوں بیلیں چڑھی ہوئیں۔ ستونوں کے سر پر پوشیدہ سوراخوں سے دھیمے دھیمے آبشار رواں جن کی ہلکی پھوار نے میری باندھنی ساڑھی کو نم کر دیا۔ لیکن یہ میرا قصور تھا۔ اتنے قریب جانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ اس دلکش دالان میں کھڑے ہو کر اندازہ ہوتا ہے کہ عجائب خانہ کی ساخت گھوڑے کی نعل کی طرح ہے۔ دو منزلوں میں میکسیکو کی کلچر کا ریزہ بہ ریزہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ ہر بڑا ہال ایک عہد پر مقسوم ہے۔

جو اندر آ کر دیکھیے تو کئی ہفتے گزر جائیں نہ دل بھرے نہ گنجینہ ختم ہو۔ صرف مقدار کا سوال نہیں ہے۔ دنیا کے ملک اٹے پڑے ہیں بیش بہا چیزوں سے۔ لیکن یہاں جس طرح ان کو ترتیب دے کر سجایا گیا ہے' وہ قابل تحسین ہے۔

کمرہ نمبر اول "انسانیت" کے نام سے معنون ہے۔ اس میں دنیا کی ہر نسل موجود ہے۔ دوسرے ہال میں اس ملک کی "ازلی" ابتدا۔ اور اس طرح ہر ہال میں انسان کا ارتقا۔ پھر "تیوتی حواکان" کا پہلا زریں عہد' پھر "تول تیک" عہد۔ جنہیں ماہرین عمارت کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں "شی شی میک" قبیلے کا باب شروع ہوتا ہے۔ یہ خونخوار وحشی بھی تعمیر کا شوق رکھتے تھے۔ اس کے بعد بلند بخت شاہان ازتک کے راج کا آغاز ہوتا ہے۔ ہر کمرے میں علاقائی تاریخ ہے۔ اوک ساکا (Oaxaca) کے متبرک شہر۔ ان کے راز حنوط اور ممی "مزتک" کے اوزار اور زیورات۔ گلف کوسٹ کے "اولمک" قبائل جنہوں نے آنے والے "زپوتک" عہد کو زراعت و سنگتراشی سکھائی۔

ایک جامع ہال "مایا" عہد کے لیے واقف ہے جو ازتک سے اہمیت میں کم نہیں۔ یہ مائن معاشرہ "یوکاتان" میں دو ہزار سال پھلتا پھولتا رہا اور ہسپانوی فاتحوں کا زبردست مقابلہ کیا۔ یہ مایا قبائل بہت نفیس اور ترقی یافتہ لوگ تھے۔ یہ علم نجوم' علم ہنر' دستی ہنر اور فنون لطیفہ پر بہت حاوی تھے۔ ان کے طلائی برتن زیورات کو دیکھ کر سیاح عورتوں کے منہ پر پانی بھر آتا ہے۔

جب آپ نچلی منزل پر تھک جائیں اور جوتی چھوٹی ہونے لگے تو اس کے ریستوران میں آرام سے بیٹھ کر کھائیے۔ کھانا اگر

KitaabPoint.blogspot.com

Automatic مشین سے نکالیے تو آٹھ آنے میں پیٹ بھر جائے۔ اگر باہر پر بیرے کو آرڈر دیجئے تو تین چار روپے میں میکسیکی ''تاکو'' اور کافی لے لیجئے۔ اس عجائب خانہ پر میں نے کئی حملے کئے تو کچھ حاصل ہوا۔ ابھی بالائی منزل باقی ہے۔ گھبرائیے نہیں' میں تو خود آپ سے زیادہ تھکی ہوئی ہوں۔ مختصر الفاظ میں یہ کہ اس منزل میں موجودہ میکسیکو کے قبائلی و علاقائی ''لوک معاشرے'' آباد ہیں جو نیچے کی منزل کا تضاد ہیں۔ ہر کمرے میں ان کے بھانت بھانت کے دیہات آباد ہیں۔ ساحل تا ساحل' کو بہ کو' قریہ بہ قریہ ہر نوع کے رہن سہن' لباس' خوراک وہاں رکھی ہے۔ آج کے زندہ میکسیکو کو اس کے ہمہ گیر تنوع میں دیکھنا ہو تو اوپر کی منزل میں گھومئے۔

اگر مجھے اس شہر میں صرف چوبیس گھنٹے دیئے جاتے تو میں ایک تہائی وقت یہاں گزارتی۔ یہ عجائب گھر' علم کا منبع! فن معماری کی معراج! جمالیات پرست کا مسجود۔ ہمارے ناظم و مہتمم اس سے اگر چند نکتے ہی سیکھ لیں تو غنیمت ہوگا۔ عجائب خانہ یادرفتہ کا تابوت نہیں ہوتا۔ اگر حاضر کو گزشتہ سے کچھ سیکھنا ہے اور مستقبل کوئی معنی رکھتا ہے تو عجائب گھر نظری تعلیم کا سب سے اہم ذریعہ ہو سکتا ہے۔

بچے میکسیکو سٹی میں گھوم گھوم کر عاجز آ گئے تھے۔ ہم نے شہر سے باہر سیر کی صلاح کی۔ کرائے پر ٹیکسی ٹھہرائی۔ میکسیکی ٹیکسی والا بھی کبھی ''نہ'' نہیں کرتا۔

''انگریزی بولنی آتی ہے؟''

''ہاں''

''راستے معلوم ہیں؟''

''ہاں''

''۱۲۵ پیسو کرایہ لو گے؟''

''ہاں''

کم بخت ایک بات پر قائم نہیں رہا اور قائم کیسے رہتا۔ ہماری بات ہی نہیں سمجھا۔ اگر ذرا بھی اسے انگریزی آتی تو سفر زیادہ مزے کا گزرتا۔

بہرحال ہم نے سب سے پہلے ''تاسکو'' کی ٹھانی۔ یہ پہاڑوں کی کوکھ میں ننھا سا شہر ہے جسے ''سیم ستاں'' کہتے ہیں۔ یہ کبھی نقرئی کانوں کا گہوارہ تھا۔ پھر تاریخ نے اسے بھلا دیا۔ اب پچھلے بیس سال میں اس کی قسمت پھر جاگی ہے۔ حکومت نے اس کی پرانی وضع قطع ذرا نہیں بدلی۔ وہی پرانی ہسپانوی ''ولا'' تنگ پتھریلی سڑکیں' زنگ خوردہ گرجا۔ کبوتروں کی بیٹوں اور موم بتیوں کی بو سے اٹا ہوا۔

KitaabPoint.blogspot.com

ننھے ننھے ریستوران بے شمار چاندی کے سامان کی دکانیں میکسیکو سے سستی لیکن جدید نمونے سے ذرا کم۔ یہاں خوب گلیوں میں ٹہلے۔ ایک ننھی سی قدیم سرائے میں کھانا کھایا۔ پھر اس خوابیدہ آتش فشاں پہاڑ سے اترائی شروع کی۔ اسی میل واپس۔

واپسی پر سڑکوں پر غریب بچے کچھ چیزیں بیچ رہے تھے۔ کار روکی تو معلوم ہوا کہ زندہ گرگٹ بک رہے ہیں۔ میکسیکی اسے بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ آ تتیں واپس! ایچی نے جلدی سے فوٹو کھینچا اور پیسے پھینک کر ہم بھاگے۔

دیہی منظر پر سکون' چاروں طرف ٹیلے اور سبزہ' راستے میں دودھ والے گدھوں پر ڈول لٹکائے جا رہے ہیں۔ امریکہ کے بعد یہ منظر ہمیں دھرتی کے قریب معلوم ہوا۔ شام کو ہم ''کرنواکا'' پہنچے۔ یہ میکسیکو سے تین ہزار فٹ نیچے ہے۔ تقریباً Tropical موسم ہے۔ کیلے کے پتے' کھجور' پام' بوگن ولیا' اور ہزار بیل بوٹے۔ اس کی تاریک سب سے زیادہ جامہ زیب' اس کے پھولوں سے ڈھکے ''ولا'' اور سبزہ زار ہیں۔ جہاں بھاری بھرکم جرنیل' وزراء اور کئی سابقہ صدر رہتے ہیں۔ سارا سال یہ مستی' موسم نہ گرمی جانے نہ سردی۔

یہاں سب سے پہلے گائیڈ آپ کو زیارت کے لیے ہسپانوی کامران ''کورتے'' کا محل دکھائے گا جو آج آئین ساز اسمبلی بن گیا ہے۔ پھر جنگ آزادی میں میکسیکو کا لیڈر ''مورے لوس'' بھی یہاں عرصہ دراز مقید رہا۔ زپاتا کے کسانوں کی بغاوت اور انقلابی معرکے بہت جذب بے والفت سے در و دیوار پر بنے ہوئے ہیں۔

ایشیا کی طرح یہاں پر بھی سامراجی عہد کی نشانیاں مٹائی جا رہی ہیں۔ خود غریب کورتے کا مجسمہ جس کے نام سے یہ محل منسوب ہے یہاں سے ہٹا کر ایک ہوٹل کو بیچ دیا گیا ہے۔

تیسرے پہر ہم ''بوردا گارڈن'' گئے۔ یہ چاندی کے کروڑ پتی سوداگر نے بنایا تھا اور یہاں ملکہ ''کارلوتا'' بیشتر وقت گزارتی تھی۔ ایک عجیب حسرت اس کے در و دیوار پر برس رہی تھی۔ وہی کیفیت جو نور جہاں کے مقبرے پر جا کر ہوتی ہے۔

''نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے''

حالانکہ سوائے پھولوں کے سب ہی کچھ تھا۔ آٹھ تالاب' فوارے' تاریخ کے خاموش شاہد' دیرینہ درخت' سنگ تراشیدہ جھروکے' ستون' ڈھلتے سورج کی برقانی دھوپ امرودوں کے درخت پر پڑ رہی تھی۔ غریب ملکہ کارلوتا!

واپسی پر رات زیادہ ہو گئی اور کار میں پھر میکسیکو کی چڑھائی' اوپر طرہ یہ کہ اپنی زندگی کا بدترین طوفان شروع ہو گیا۔ موسلادھار بارش باوجود Wipers کے ناک کے آگے کچھ نہ سوجھے۔ پہاڑوں میں ننھی سی لال ٹیکسی ایک بیر بہوٹی کی طرح رینگ رہی تھی۔ بجلی

KitaabPoint.blogspot.com

کوندکوند کر ہماری کار کے "ونڈ اسکرین" پر گرے۔ ساری آیتیں قرآن کی دہرا دیں۔ کیا کڑک کیا چمک! معلوم ہوتا تھا فطرت اپنا صدیوں کا دبایا ہوا غیظ و غضب آج ہی نکالے گی۔ شکر شکر کرکے ختم ہوا طوفان۔ مطلع صاف ہوا۔ کچھ دور نیچے وادی کے برقی قمقمے چندھیاتے نظر آئے۔ تاروں کی دودھیا دھنک میں پہاڑوں کے سیاہ دیوتا لمبے لمبے لیٹے تھے۔

اگلے روز ایک قریب کے گاؤں "فی ایستا" جا دھمکے۔ وہاں کی دیرینہ باشندہ ایک امریکن بڑھیا اپنے قدوقامت کی وجہ سے ہماری عمدہ محافظ اور باڈی گارڈ بن گئی۔ شکر ہے لوگ کافی پینے میں مست تھے۔ ہم پر نظر عنایت کی۔ ٹکیلا ان کی ظالم ٹھرے کی طرح کی مشروب ہے' وہ تھوڑے سے کشید ہوتی ہے۔ وہ پی پی کر خوش باش کسان گھیرا ڈال کر ناچ رہے تھے' باقی تالیاں بجا رہے تھے اور گا رہے تھے۔ کوئی دقیانوسی "ماریاچی" جو ہمارے میراثی کے ہم وزن اور ہم معنی ہیں اپنے باجوں پر گھسی ہوئی دھنیں بجا رہے تھے۔ ویسے میکسیکو میں ردی سے ردی "ماراچی" کالے لباس اور چاندی کے بٹن پہنے بہت وجیہہ نظر آتے ہیں۔ کبھی لوگ ناچتے تھک گئے۔ پھر دیر تک خاموشی پھر ایک دم کہیں پٹاخے چھوٹے' پھر بھگدڑ مچی۔ جوش اٹھا' پھر اپنی جان ہلکان کرنی شروع کر دی۔

یہ غریبوں کی تفریح ہے۔ اس میں ان صاحبان کو مزہ نہیں آ سکتا جو کلاسیکی بیلے اور ٹی وی کے عادی ہیں۔ ان تفریحات میں بے ترتیبی' بے تکلفی' بدنظمی' مزاح و مستی شامل ہے کہیں کسی کا جھنڈا کھو گیا۔ کسی کی ٹوپی اڑ گئی۔ کسی عورت کا کنگا یا پھول چوم لیا۔ غرضیکہ اچھا لطف رہا۔ امریکن بڑھیا بولی۔ یہ تو "منی فی ایستا" تھا۔ یہ تو کچھ بھی نہیں' اگر تم سال بھر اس ملک کے رہو تو ہر مہینے کوئی نہ کوئی "فی ایستا" دیکھو۔ یہ مخصوص مذہبی دنوں یا موسمی تہواروں پر منعقد ہوتے ہیں اور ان میں ساری آبادی ٹوٹ پڑتی ہے۔ ان "فی ایستا" میں علاقائی لباسوں' کھیلوں اور آتش بازیوں کا مقابلہ بھی ہوتا ہے۔ ایسٹر کی چھٹی میں یہ بالکل راون کی طرح جوڈا کا آتشی پتلا بنا کر فلیتے لگاتے ہیں اور جب وہ پھٹتا ہے تو اس طرح خوش ہوتے ہیں۔ گویا مسیح فروش کا آج ہی انتقام لیا جا رہا ہے اور "یلا لوپ گرجا کی کنواری حضرت مریم کا جشن کئی دن چلتا ہے۔ اگر تم نے یلا لوپ کی زیارت نہ کی تو اس ملک سے ناواقف رہ جاؤ گی۔ میں نے کہا "اپنی ننھی سی جان کو کہاں کہاں لے جاؤں اور کیا کیا دیکھوں۔" پہلے ہی ہم میکسیکو میں پروگرام کے خلاف زیادہ ٹھہر گئے تھے۔ جو ہفتہ ہم نے لاس ویگاس اور شکاگو کے لیے مقرر کیا تھا۔ وہ بھی یہیں گزار دیا۔ اور میرا بس نہ چلے کہ ان کی تین گٹھڑیاں بنا کر لاس ویگاس پارسل کر دوں۔ آخر میں یہی جیتے۔ اپنے والد کے ساتھ سازش کر کے میرا "جمیکا" کا سفر تو رینڈ و کروا دیا اور اپنے مرغوب امریکی شہر دیکھے۔

میکسیکو کا کوئی ذکر مکمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک آپ اس کی "بل فائٹ" نہ دیکھیں۔ میرا بالکل ارادہ نہیں تھا۔ اس کے متعلق لکھوں کیونکہ زیادہ تر قارئین نے یہ تماشا کم سے کم فلموں میں تو ضرور ہی دیکھ رکھا ہے۔ پھر مجھے خود ڈر تھا کہ شاید یہ خونریزی وحشی کھیل میری

KitaabPoint.blogspot.com

نازک انتڑیاں برداشت نہ کر سکیں۔ اتفاق سے میکسیکو کی ایک کتاب ہاتھ آئی۔ جس کے اولین باب میں ہیمنگ وے نے ایک سوال پوچھا تھا۔

"آپ کس کی طرف ہیں؟"

"سانڈ کی طرف یا انسان کی طرف؟"

"اگر آپ سانڈ کے طرف دار ہیں تو ہرگز یہ لڑائی نہ دیکھیں۔ اگر انسان کے خیر خواہ ہیں تو یہ سمجھ لیجئے کہ سانڈ کو مارنا نہایت اہم ہے۔ ورنہ وہ انسان کے پارچے کر سکتا ہے۔ ایک پلا ہوا سانڈ افریقہ کے شیر ببر کو سینگوں پر اچھال کر پھینک سکتا ہے' انسان کیا شے ہے! دوسرے یہ کہ اگر اسے آج نہ مارا جائے تو کل پرسوں ویسے بھی وہ کسی قصاب کے ہاتھوں ذبح ہو گا کیونکہ اس کا گوشت شوق سے کھایا جاتا ہے۔"

یہ پڑھ کر ہماری انتڑیوں کو نفسیاتی تکیہ حاصل ہوا۔ ہم نے کمر باندھی' برساتی لی (کیونکہ چار بجے کے بعد پھوار لازم ہے) بچے پہلے سے کہیں زیادہ اچھلتے رہے۔ یہ "بل رنگ" Eltorio تھی لاطن امریکہ کا سب سے وسیع میدان ہے اور چاروں طرف اوپر تک ایک لاکھ آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ ہفتے میں تین روز کھچا کھچ بھرا رہتا ہے۔ چاہے کوئی موسم ہو۔ گرمیوں میں اس کے بہترین کھلاڑی اسپین جاتے ہیں اور سردیوں میں دنیا کی اعلیٰ ٹیمیں یہاں آتی ہیں۔ خیر ہم نے پہلے سے ٹکٹ لے رکھے تھے ورنہ بلیک میں تگنے داموں کے ملتے۔ گائیڈ بہت سارے تھے۔ آسانی سے سیٹ مل گئی۔ وہی بینڈ' وہی پریڈ' وہی جج صاحبان کا جلوس' وہی میٹاڈوروں کا تام جھام معلوم ہوتا تھا بس "ریٹا ہیورتھ" کی کسر ہے۔ اتنے میں ایک سیاہ فام بربریت پھن پھناتی ہوئی داخل ہوئی۔ اس کا نام اور وزن بھی تختے پر جلی الفاظ میں آ گیا۔ خیر اس تمام ڈرامے کے تینوں ایکٹ سے ہم روشناس ہوئے۔

پہلی دو لڑائیاں تو باوجود دہشت کے دیکھ لیں۔ پھر ذرا ذرا مزہ آنے لگا۔ خون منہ کو لگ گیا۔ اس کے علاوہ Herd Instinct کا بھی تقاضا تھا۔ تیسری لڑائی میں ہم نے بھی تالیاں بجا بجا ہتھیلیاں لال کر لیں۔ پھر جمائی آئی۔ چلو گھر۔ بچوں نے کہا "نہیں' ہرگز نہیں۔" پھر بیٹھ گئی۔ اتنے میں ایک شریر سانڈ جو اکھاڑے میں گھسا تو کسی کے قابو میں نہ آئے۔ اور آؤ دیکھا نہ تاؤ' ایک چھلانگ لگا کر کم بخت ججوں کی گود میں آن گرا۔ جو افراتفری مچی کہ ہنسی کے مارے برا حال۔ مسلح سپاہیوں اور ماہرین نے اس آتش شرارے کو مشکل سے رام کر کے اپنے کھونٹے پر پہنچایا۔

پھر چوتھی بازی شروع ہوئی۔ خاصی پھس پھسی۔ میٹاڈور کوئی ڈرپوک اناڑی تھا۔ نہ شمشیر بھونک سکا نہ سانڈ کو پینترے دکھا سکا۔

KitaabPoint.blogspot.com

لوگوں نے آوازیں کسنی شروع کیں۔ یہ ناظرین بھی ظالم نسل ہوتے ہیں۔ کسی کو نہیں چھوڑتے۔ پھر یہ کہ وہاں کی ''چناؤ کمیٹی'' بدنام ہے۔ اپنے پٹھو پالتی ہے اور بعض سور ماؤں کو نہیں بھیجتی۔ اب اس ظالم کھلاڑی پر صلواتیں پڑنی شروع ہوئیں۔ ہمارے یہاں سڑے انڈے ٹماٹر پھینکے جاتے ہیں۔ میکسیکو میں بھدے پھسڈی میٹاڈور پر کشن اور تکیے پھینکے جاتے ہیں۔ پلک جھپکتے ہی اکھاڑے میں درجنوں کشنوں کے ڈھیر ہو گئے۔ اتنے میں نہ جانے کہاں سے ایک نہایت وجیہہ شکل نوجوان لڑکے نے زقند لگائی اور عین اکھاڑے کے بیچ میں سفید پتلون میں کھڑا ہو گیا اور اپنے تہی ہاتھوں سے سانڈ کو للکارا۔ سارے عوام میں شور مچ گیا کہ یہ روپ اور شکتی کا دیوتا کہاں سے اترا۔ سانڈ بھی نظر پہچانتا ہے۔ مسکین پر شیر تھا اور اس جانباز کو دیکھ کر پیچھے ہٹنا شروع ہوا۔ پھر اس جوان نے سانڈ کے عین سامنے نہتہ جا کر گھٹنے ٹیک کر پھر ''تورو تورو'' کر کے چیلنج کیا۔ اس پر تو حاضرین خوشی و فخر سے پاگل ہو گئے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دی۔

ہماری مرحبا اور روسی برادو کی بجائے یہ لوگ اولے اولے پکارتے ہیں۔ تالیوں اور اولے اولے سے فضا بہری ہو گئی۔ ہم نے بھی اولے اولے چیخ کر گلا بٹھالیا جو جس کے ہاتھ میں تھا' اس پر نثار ہو رہا تھا۔ پھول' ریشمی رومال خواتین نے اپنی حسین کنگیاں' دستانے' مصنوعی زیور بھی وارنے شروع کر دیے۔

ہمارا جوش میں برا حال' اُدھر جج صاحبان کا ہم سے برا حال۔ کیونکہ اس جوان نے ان کے پٹھو کی نالائقی کو طشت از بام کر دیا۔ پولیس بھیجی گئی۔ اس کو پکڑنے کے لیے۔ جب تک پولیس آتی اس جانباز ہیرو نے شمشیر چھین کر سانڈ کے عین گردن کے پٹھوں میں بھونک کر اسی سرعت سے پھر زقند لگا کر اوپر اپنی نشست میں واپس آ گیا۔ لوگوں نے اسے اپنی پیٹھ پر بٹھا کر جلوس نکالنا چاہا تو پولیس پہنچ گئی۔ اس کو گرفتار کر کے پانچ سو پیسو جرمانہ کیا۔ یہ حسین جوان اپنی قوم کو جتانا چاہتا تھا کہ ''سلیکشن کمیٹی'' کتنی نالائق اور نامنصف ہے۔

خیر ایک ڈرامے کے اندر دوسرا ڈرامہ دیکھ کر ہم پرمن ہو گئے۔ ایک ٹکٹ میں کئی مزے یہ بل فائٹ بھی یاد رہے گی۔ باہر نکلے تو چھابڑی والے' ریڑھی والے' ہماری طرح چاٹیں بھنے ہوئے بھٹے وغیرہ بیچ رہے تھے۔ ہم نے خوب الا بلا کھائی اور رات بھر پیٹ کے درد میں خوب روئے۔

کسی ملک کی ترقی کا معیار اس کی تعلیم سے کرنا چاہیے۔ میکسیکو کی حکومت نے تعلیم کو ایک جہاد کی سی اہمیت دی ہے۔ نہ صرف شہروں میں بلکہ دور افتادہ پہاڑوں کی بستیوں میں بھی تعلیم بالغاں کا پروگرام شروع کیا ہے۔ استاد گھوڑوں خچروں پر جا کر مدرسے

KitaabPoint.blogspot.com

لگاتے ہیں۔ پرائمری تعلیم لازمی اور مفت ہے۔ سارے ملک میں اکیس یونیورسٹیاں ہیں۔ خوددار السلطنت میں نصف الارض کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے جو کئی طوفانی مدوجزر کے بعد حکومت نے ایک لامحدود رقبے میں قائم کی ہے۔ ہر شہر کے اندر ایک شہر آباد ہے۔ اسی یونیورسٹی کو پانچ کروڑ ڈالر کی رقم سے درجنوں ماہرین عمارت' مصوروں' سنگ تراشوں نے آراستہ کیا ہے۔ اس کے رقبے میں اسی فلک بوس عمارات ہیں۔ کھیل کود کے لیے تقریباً سوا لاکھ نشستوں کا اسٹیڈیم ہے پون میل لمبی فنون لطیفہ کی عمارت ہے' بارہ منزلہ کتب خانہ ہے اور دنیا کا سب سے وسیع نہانے کا تالاب ہے۔ اس تالاب کے نیچے ایک شیشے کی کھڑکی ہے جہاں سے میں نے تیراک لڑکے لڑکیوں کے کچھ فوٹو بھی کھینچے تھے۔ مخلوط تعلیم و مخلوط کھیل میں جنسی تفوق کا احساس بہت کم ہو جاتا ہے۔ ہر عمارت پر میکسیکو کے مخصوص میورل درخشاں ہیں۔ آنکھیں ان کو دیکھ دیکھ کر دکھ جاتی ہیں لیکن دل نہیں بھرتا کیونکہ ہر میورل ایک نئی داستان ہے۔ ایک نئی ترتیب حسن ہے۔

حکومت زیادہ تر پیسہ خود خرچتی ہے۔ اس لیے فیس برائے نام ہے (تقریباً روپے سالانہ) داخلی امتحان آسان ہے۔ اس لیے ۷۵ ہزار طلباء الل ٹپ بھرے ہوئے ہیں۔ کچھ پروفیسر شاکی تھے کہ بہت آسانیاں بہم پہنچانے سے بہت سے طلباء لاڈ میں بگڑ گئے ہیں اور تعلیمی معیار گر گئے ہیں۔ طلباء شور مچا کر ہر دفعہ پرچے آسان کروا لیتے ہیں لیکن بایں ہمہ آسانشوں کے طلباء پھر بھی اکثر بلوے کرتے ہیں۔ کبھی بسیں جلا دیں۔ فرنیچر جھیل میں ڈال دیا۔ کبھی ہڑتال کر دی۔ میں نے کئی دفعہ سوال کیا کہ کیوں؟ کوئی وجہ ضرور ہو گی۔ ایک دو نے دبی زبان سے کہا کہ اصل میں طلباء کی ذاتی شکایات کم ہیں۔ سیاسی زیادہ ہیں۔ انہیں گلا گھٹی جمہوریت پسند نہیں۔ زیادہ آزادی رائے مانگتے ہیں۔ پھر ان کی اکثریت سرمایہ دارانہ نظام کی سخت خلاف ہے۔ زیادہ تر جوان اپنے قومی مسائل کا فوری حال سوشلزم کو تصور کرتے ہیں اور طلباء کی آخری چڑ بیرونی دخل در معقولات ہے۔ جتنا وہ شمالی امریکنوں سے بیزار ہیں اتنا ہی ان کا اثر سیاست اور اقتصادیات میں پاتے ہیں۔

میکسیکو کے متعلق جو بھی اتنے دنوں میں اور اس سے پیشتر مطالعہ اور تبادلہ خیالات سے اندازہ ہوا۔ وہ یہ کہ کئی باتوں میں ہم سے بہت آگے ہیں اور کئی چیزوں میں ہم سے مشابہ۔ ہماری طرح اس کی سب سے نمایاں ترقی خوراک میں ہے۔ اس مشکل جغرافیہ والے ملک کو خوراک کی پیداوار میں مکمل خود اعتمادی حاصل ہے۔ یہ کسی بیرونی طاقت کو "ان داتا" نہیں مانتا بلکہ خوراک برآمد کرتا ہے۔ اس کی گیہوں غلے کی کاشت سو فیصد میکانکی طریقوں سے ہوتی ہے۔ سوائے بھاری مشینری کے (جو امریکہ سے آتی ہے) ساری ضروریات خود ساخت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ کاریں اور زرعی آلات بھی۔

KitaabPoint.blogspot.com

اقتصادیات میں کیپٹل ازم غالب ہے۔ Free Enterprise کو بالکل کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے۔ سوشلزم کو صرف یہاں تک اجازت ہے کہ تیل قومیا گیا ہے۔ بجلی' ٹیلیفون اور ریلوے بھی حکومت کے پاس ہیں۔ ٹیکسی بھی بہت ہلکے ہیں۔ صرف پچیس فیصد امیروں پر۔ امریکنوں کو ۴۹ فیصد سرمایہ لگانے اور ۱۵ فیصد اپنا اسٹاف رکھنے کی اجازت ہے۔ نظام سرمایہ داری سے ترقی کے پہیے تیز تو ہوئے لیکن اس کے فوائد صرف ایک خاص طبقے تک محدود رہتے ہیں۔ پھر سرمایہ دارانہ نظام اپنے ساتھ سماجی بے ایمانی' رشوت ستانی لاتا ہے۔ جاپان' امریکہ' انڈونیشیا کی طرح یہاں پر بھی کھلی عیال داری چل رہی ہے۔ امریکی تسلی دیتے ہیں کہ یہ ترقی کی قیمت ہے۔ یہ لاطن امریکہ کا تیسرا گنجان ملک اپنے محدود ذرائع اور صنعتیں لے کر بھی عوام کو پورے حقوق نہ دے سکے۔ سماجی اور طبقاتی امتیاز یہاں بہت کیا جاتا ہے۔ بڑی بڑی جاگیریں جن کو Hacienda کہا جاتا ہے۔ انیسویں صدی تک دیہی اکثریت کو اپنے پنجوں میں جکڑے ہوئے تھیں۔ غریب مزدوروں کو طرح طرح کی بندشوں اور قرضوں میں مقید رکھتی تھیں تاکہ بھاگ نہ سکیں۔ شہروں میں بدنظمی اور بیروزگاری عام تھی۔

اس لیے میکسیکو میں صرف دو طبقے تھے۔ بے حد غریب یا بے حد امیر۔ اب پچھلے تیس سال میں متوسط طبقہ ابھرنے لگا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ طبقہ صرف ۲۳ فیصد ہے اور وہ بھی اس طرح کہ چھوٹے دیہاتی زمیندار Rancheros اپنی اپنی زمین بیچ کر شہروں میں آن کر بس گئے ہیں اور کاروباری بن گئے ہیں۔ ان کے شمار سے کچھ متوسط طبقے میں جان آ گئی ہے۔ حکومت نے ایک قابل تحسین کام کیا ہے کہ سرکاری ملازمین کے لیے بے شمار سستے گھر بنا دیئے گئے لیکن یہ صرف آٹے میں نمک والی بات ہے۔ ورنہ غریبوں کو اب بھی انصاف نہیں ملا۔ دیہاتوں میں اگر ان کی روایتی شریکے والی زمینیں Ejido نہ ہوتیں یا قدیم انڈین نظام یعنی مشترکہ امداد باہمی کے اصول پر ملکیت نہ ہوتی تو یہ معصوم عوام گرگ زمینداروں اور پادریوں کے جبڑوں میں پھنسے ہوتے۔

''کارڈناز'' کو خدا جنت نصیب کرے جس نے کم سے کم شروع میں میکسیکو کے منہ کو سوشلزم تو لگایا۔ دہقانوں کو ملکیت دے کر وقار دیا۔ ''لیبر یونین'' قائم کئے ۱۹۳۸ء میں سب تیل کی کمپنیوں کو قومیا اجارہ داری ختم کی۔ کارڈناز نے قومی فخر کو دوبالا کیا۔ مگر افسوس کہ تجارتی طاقتوں نے اس کے ہاتھ روکنے شروع کئے اور اس کا اثر زائل کر کے قدامت پسند عناصر کو ابھارا۔ پھر یہ رومن کیتھولک ''جنرل کماچو'' برسراقتدار لایا گیا۔ جس نے سرمایہ داری اور گرجا دونوں کو از سر نو تازہ کیا' اور جب سے اب تک انہی خطوط پر ''پالیسی'' وضع ہوتی آئی ہے۔ موجودہ صدر ''دیاز اور یاس'' کا ایک سال باقی ہے' امریکہ ان سے خوش ہے اس لیے مغربی صحافت بھی ان کی قصیدہ گو ہے جس کو پیا چاہے وہی سہاگن۔

KitaabPoint.blogspot.com

ایک شام ہم نے وزارت زراعت کے سیکرٹری اور ان کی بیگم کے ساتھ گزاری۔ انہوں نے از سر نو شہر کی سیر کرائی۔ پر تکلف ریستوران میں کھانا کھلایا۔ ہمارے فوٹو کھنچوائے۔ ان سے باتوں باتوں میں بہت معلومات حاصل کیں۔ مثلاً یہ کہ یہاں عورتیں بہت آزادی پا چکی ہیں۔ سفیر اور ڈپٹی منسٹر بن چکی ہیں۔ تعلیمی نظام میں ۹۰ فیصد ڈاکٹری میں ۲۵ فیصد چھائی ہوئی ہیں۔ میں نے اپنے میزبانوں سے انگریزی محاورے میں پوچھو کہ "آپ میں سے کون گھر میں پتلون پہنتا ہے۔" سیکرٹری صاحب فوراً بولے۔ "میں.......؟ میکسیکو میں میری ذات راج کرتی ہے۔" یہی پتہ چلا کہ گھر میں مرد مطلق العنان ہے اور عورت کی عموماً کچھ نہیں چلتی۔ یہ مردانیت بھی اس ملک میں عجیب و غریب معمہ ہے۔ یہ ایک قلعہ ہے۔ ایک طریقہ حیات ہے۔ ایک مذہب ہے۔ بڑے نفسیاتی ماہرین نے اس کا تجزیہ کیا۔ ہسپانوی انا "شی ولری" اور انڈین آبرو زاکت۔ احساس کا یہ مرکب "ماچی سما" کے نام سے سارے لاطن امریکہ میں مشہور ہے۔ وہ کیا شے ہے جو ایک میکسیکی کو پل بھر میں لڑنے مرنے پر اور دوسرے لمحے عورت کے قدم چومنے پر تیار کرتی ہے۔ بزم میں چھیلا بن کر کبھی رزم میں سورما بن کر نکلتی ہے۔ کوئی ماہر قیاس آرائی کرتا ہے کہ ماچی سما اپنے آپ کو مرد ثابت کرنے کی ایک مسلسل کوشش ہے۔ یہ ماچی سما غربت کا بھی پروردہ ہے۔ یہ ایک شرابی ماچو اپنی بیوی کو ٹھونگے گا کہ پیسے کیوں مانگے۔ چلتی کار پر گولی چلائے گا کیونکہ اس کے پاس کار نہیں ہے۔"

البتہ اس ماچسمو کے شوخ زاویے بھی ہیں۔ ایک مرد کی کسی چلتی عورت سے ٹکر ہو جائے تو بجائے معافی مانگنے کے وہ کہے گا۔ "کیا خوب!" کسی اجنبی سیمیں بدن کے سامنے دوزانو ہو کر کہے گا۔ "جب سے تم زندگی میں آئی ہو۔ میری جان لیوا بیماری دور ہو گئی ہے۔ میری ماں کو خبر دے دو کہ پریشان نہ ہو اب میں بچ گیا۔

میکسیکو نے صدیوں کی خوں فشانی اور خانہ جنگی کے بعد یہ سبق سیکھا ہے کہ سیاسی استحکام بہت ضروری ہے۔ اس لیے ہر قومی صدر کو چھ سال کا کھلا چھٹا ملتا ہے لیکن وہ چھ سال کے بعد دوبارہ نہیں چنا جا سکتا۔ اس لیے یہ لوگ خوش ہیں کہ ان کا صدر دوبارہ الیکشن کے لیے داؤ پیچ میں نہیں پڑتا۔ دوسرے یہ کہ سارے ملک میں ایک مضبوط پارٹی پی آر آئی (P.R.I.) ہے جو انقلابی نعروں پر ووٹ حاصل کرتی ہے۔ حالانکہ اب اس کے پروگرام انقلابی بالکل نہیں رہے۔ پھر بھی ہر مخالف پارٹی عوام کے قریب نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے نام میں "انقلاب" نہیں ہے اور انقلاب کے نام پر میکسیکی عوام جان دینے کے لیے تیار ہے۔ اس لفظ سے ان کی تاریخی یادیں وابستہ ہیں۔ جس طرح ہماری دونوں لیگیں "مسلم" کا لفظ نہیں ہٹا سکتیں۔ اسی طرح پی آر آئی لفظ "انقلاب" نہیں ہٹا سکتی۔

دوسری قابل ذکر سوشلسٹ پارٹی ہے جس کا لائحہ عمل وہی ہے جو لوگ چاہتے ہیں لیکن اس کو ابھرنے کی اجازت نہیں۔ ایک جذبہ

KitaabPoint.blogspot.com

لاطن امریکہ میں نمایاں اکثریت پکڑ گیا ہے۔اور وہ ہے ''اینٹی گرنگو ازم'' (Anti Gringoism)...... گرنگو وہ شالی امریکن یعنی یانکی کو کہتے ہیں اور حقارتاً استعمال کرتے ہیں۔ یہ جذبہ عام ہے اور جائز ہے۔امریکن ان کی زمین کھا گیا' زر کھا گیا اور اب بھی لاطن امریکہ کو سیاسی اور اقتصادی بیڑیوں میں جکڑنا چاہتا ہے۔ ہر جگہ امریکن اکڑ کر چلتا ہے' زور سے بولتا ہے' پٹخ کر پیسے پھینکتا ہے۔ لاطن امریکی پیسے جھک کر اٹھاتا ہے اور ''یانکی'' کی پیٹھ مڑتے ہی اس پر لعنت بھیجتا ہے۔

میکسیکو اور پاکستان کے کئی پہلو یکساں ہیں۔ دونوں سابقہ غلام سامراج' دونوں زرعی' غیر ترقی یافتہ' دونوں تعلیم میں پیچھے لیکن کوشاں۔ ان کے پچیس فیصد بچے مدرسے تک نہیں پہنچے۔ قومی دولت بڑھ گئی ہے لیکن امیر غریب میں ابھی تک تفاوت تشویش کن ہے۔

مذہب کا غلبہ لوگوں پر مکمل طور پر ہے۔ کیتھولک دین نے خوبیوں کے ساتھ برائیاں بھی پھیلائی ہیں۔ انقلاب کے بعد لیڈروں نے اسی مذہب کو پشت پر ڈال دیا تھا کیونکہ یہ عوام کی ترقی میں حائل تھا۔ ۱۹۱۷ء کے آئین نے گرجا کی تعلیمی' سیاسی اور اقتصادی کارروائیوں پر سخت ممانعت لگا دی تھی۔ لیکن حال کی حکومتوں نے اس لگام کو ڈھیل دے دی۔ ۱۹۵۹ء کے بعد ۲۰ نئے گرجا بنے اور ۲۳ زیر تعمیر ہیں۔ گرجا پھر ایک سیاسی عنصر بن گیا ہے۔ اس کی دقیانوسی تربیت کی وجہ سے خاندانی منصوبہ بندی ٹھپ ہو گئی ہے۔ ہماری طرح میکسیکو کی آبادی ماشاء اللہ روز افزوں ہے۔ اس ملک کی بھی ساری اقتصادی ترقی دھری رہ جاتی ہے۔ اگر اس کا پھل کھانے والے دگنے تگنے ہو جائیں۔ ہمارے ''پین سیون'' میں امریکہ کے کچھ پروفیسر آئے ہوئے تھے جو میکسیکو پر بہت کچھ تحقیق کر چکے تھے۔ ایک شام ان سے گفتگو میں بہت دلچسپ نکتے نکلے۔ مثلاً یہ کہ ان کے نظریے سے ایک خوش آئند شگون یہ ہے کہ عوام لکیر کے فقیر نہیں رہے۔ زمانے کے ساتھ بدلنا چاہتے ہیں۔ بجائے ''تورتلا'' کے تندور کی ڈبل روٹیاں کھاتے ہیں۔ نیم حکیم خطرۂ جان ''کیوران ڈیرو'' کے بجائے ڈاکٹر بلاتے ہیں۔ شہروں میں ٹیلیویژن' گیس' نائلون' المونیم اور امریکی کارٹونوں نے ازلی طرز زندگی بدل ڈالے ہیں۔ جب ہمارے دیہاتوں میں بھی دھاتی کٹوروں اور آبخوروں کے بجائے پلاسٹک کے گلاسوں میں پانی پیا جاتا ہے تو اس تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے تو پاکستان اور میکسیکو میں کئی مشابہ حالات نظر آئے۔ میکسیکی کھانے کے مسالے اور مزے ہم سے قریب ہیں۔ ان کی دستکاریوں میں ہمارے نمونے ملتے ہیں۔

نسلی طور پر بھی ہماری طرح مخلوط ہیں۔ ہم دونوں قومیں Mestizo کہلائی جا سکتی ہیں۔ نفسیاتی رو سے بھی ہم میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ ہماری طرح ان میں بھی ایک شاندار ماضی کی یاد زندہ ہے۔ ''پدرم سلطان بود'' ان کا ردعمل بھی عموماً جذباتی ہوتا ہے۔ ہماری

KitaabPoint.blogspot.com

طرح تنگ مزاج، گرم دل، دوست نواز نظر آئے۔ ہر جگہ ہماری خاطر تواضع بہت دل سے کی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ سست اور پابندی اوقات سے آزاد اور رومان پسند لوگ ہیں۔ ان کے سارے آرٹ میں ان کی اندرونی قنوطیت عیاں ہوتی ہے۔ ان کے کئی گیت ''پھوٹی قسمت پھوٹے کرم'' پر بنے ہوئے ہیں۔

ہماری طرح یہ توہمات پرست ہیں۔ میں ہوٹل کو خیرباد کہہ کر جب ''چین سیون'' میں آکر بسی تو دوسرے ہی دن زبردست زلزلہ آیا۔ سوتے سوتے آتش فشاں نے غالباً کروٹ لی، یہ میکسیکو میں دس سال کے بعد پہلا ہولناک بھونچال تھا۔ اوپر کی منزل سے جو میں نے جھانکا تو ساری سڑک اور کاریں اس طرح ہل رہی تھیں جیسے رواں پانی۔ اس وقت مالک مکان آدھمکے بولے۔ ''سینورا، آپ کا آنا کچھ بدشگونی سے شروع ہوا ہے۔'' میں نے اشارہ سمجھ لیا اور ان کا کرایہ بڑھا دیا۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

سان فرانسسکو

''وین کوور'' کے بعد ہمارے جہاز نے سان فرانسسکو کا رخ کیا۔ رات کے گیارہ بجے آسمانی ستاروں کو پشت پر چھوڑتے ہوئے شہر کے برقی ستاروں کو چیرتے ہوئے اترے۔ کسٹم کے تکلفات اور ہوٹل کے غلط پتے کے باعث اپنے کمرے میں پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ بج گیا۔ نہا دھو کر نکلی تو سخت بھوک لگی۔ میں ہوائی جہاز میں بہت کم کھا سکتی ہوں۔ اس لیے زمین پر پاؤں لگتے ہی آنتیں غرغر کرتی ہیں۔ دو بجے رات مجھ کو کون کھانا دے گا؟ بچے اور میاں تو سونے کی نیت رکھتے تھے۔ میں تو خالی پیٹ سو ہی نہیں سکتی۔ ڈائننگ روم سو چکا تھا۔ میں ہوٹل سے باہر نکلی۔ ساتھ ہی نکڑ پر ایک ریستوران پر لکھا ہوا تھا۔ ''یہ کبھی نہیں سوتا'' میں نے کہا ''مرحبا! یہ ہے ایک زندہ دل شہر کی نشانی۔'' اندر گئی تو واقعی رت جگا تھا۔ کئی مرد عورتیں بچے کھا پی رہے تھے۔ میں نے اپنا مرغوب ''ٹیونا فش سینوچ'' اور ملک شیک کا آرڈر دیا۔

اس شہر کی زندگی دیکھ کر سونے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ خیر! تھکی ہوئی تھی' واپس لوٹ آئی۔ دوسری صبح ہمارے میزبان مسٹر موئیز نہائے دھوئے اپنے قد برابر لمبی کار لے کر دس بجے حاضر۔ غریب نے پانچ دن صبح و شام ہم کو اس بے پناہ' بیتاب شہر کا چپہ چپہ دکھایا۔

سان فرانسسکو میں امریکنیت سب سے کم ہے۔ اس لیے یہ شہر مجھے سب سے زیادہ بھایا۔ امریکہ میں مجھے رہنے کی کوئی تمنا نہیں۔ لیکن اگر مجبوراً رہنا پڑے تو یہ ایک شہر ہے' جہاں میں دو تین سال گزار سکتی ہوں۔ اس شہر کا نہ تو نیویارک کی ''دم بخت'' مخلوق سے تعلق ہے جو فلک پیما شکنجوں میں تجارتی دل رکھتی ہے نہ واشنگٹن کی سرکاری فضا میں مشابہت۔ جہاں عموماً دفتری حبس اور سیاسی بیوپار چلتا ہے۔

سان فرانسسکو ایک شہر نہیں' شخصیت ہے اور اس شخصیت کا مخصوص پہلو انفرادیت ہے۔ امریکہ میں شمال سے جنوب تک ایک بیزار کن یکسانیت نظر آتی ہے۔ یہاں ایک تنوع ہے۔ اس کے جغرافیہ میں تنوع' معاشرے میں تنوع' شہری خدوخال میں جدت' باشندوں میں ہمہ گیر اختلاف۔ یہ امریکہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ اتنا ہی انسانیت کے قریب تر آتا جاتا ہے۔ انسان کی طرح یہ بھی ایک وقت میں سب کچھ ہے۔ فراخ دل' یہودی صفت' حسین' غلیظ' روشن' تاریک۔ کبھی ہنگامہ خیز' کبھی خاموش۔ بیک وقت تخلیقی اور انحطاطی! متعصب مگر پھر بھی روادار........ اس کی کون تشریح کرے؟

KitaabPoint.blogspot.com

اس شہر کی تاریخ ضعیف ہے۔ یہ خود جوان ہے۔ یہ اپنے افسانوی گزشتہ طلائی تمدن کو مڑ مڑ کر دیکھتا ہے۔ ذرا خاموشی سے سنیں تو اس کے سمندری ساحلوں کی بلند موجوں میں کئی شور پنہاں ہیں۔ شروع میں آبی پرندوں کے غولوں کا' پھر ازلی باشندوں کے منتروں کا' کبھی برطانیہ کے "سمندری کتوں" کا۔ کبھی قدیم مبلغوں کی کلیسائی گھنٹیوں کا۔

جب اس کی سرزمین پر امریکی پرچم لہرایا اور ہسپانوی پرچم سرنگوں ہوا تو قسمت سے سونا دریافت ہو گیا۔ گھاٹ گھاٹ کے منچلے قسمت آزمانے پہنچ گئے۔ برسوں لوٹ کھسوٹ مارکٹائی ہوتی رہی اور ابھی تو یہ محض ڈرامے کا آغاز ہے۔ اس شہر کی تلاش میں نکلیں تو شہر نہیں ملتا۔ اس کی شناخت کیسے کریں؟ ایک طرف حبشیوں کے حسرت کدے' دوسری طرف چینیوں کے مخصوص محلے۔ مغربی دنیا کا سب سے بڑا "چائنا ٹاؤن" یہاں ہے کھچا کھچ بھرا ہوا۔ ٹیلیفون ڈکشنری اٹھا کر دیکھو تو "لی وونگ فونگ" سے صفحے کالے۔ کہیں اطالویوں کے مخصوص طعامی اڈے اور اخبارات کہیں چند سنکی کروڑ پتیوں کے خیراتی عجوبے اور فنی ادارے۔ ایک چیز جو بالکل دکھائی نہ دی۔ وہ تھی ہسپانوی کلچر یا کم سے کم اس کے بچے کھچے نشان۔ سوائے چند ہسپانوی ناموں کے (وہ بھی محض سڑکوں یا محلوں کے) اور کوئی علامت اس معاشرے کی نہیں جو اس کا فرمانروا تھا۔ یہاں کے عجائب خانے بھی اس عہد پر عمداً خاموش ہیں۔ غالباً اس کی یاد سے ان کے ضمیر کو تکلیف ہوتی ہے اور "میکسیکو" کا تو نام لو تو ہمارے ملنے والے نظر بچا کر موضوع بدل دیتے تھے۔ اس شہر کا سب سے نرالا راز یہ ہے کہ اس میں بے شمار ننھی پہاڑیاں ہیں اور ہر پہاڑی میں ایک مخصوص علاقہ بسا ہوا ہے۔ ان علاقوں کا ضروری نہیں کہ صرف شاہراہوں سے رشتہ ناطہ جوڑا جائے۔ کہیں رشتے کی کڑیاں آبی پل ہیں۔ کہیں سنگلاخ یا چوبی زینے۔ مجھے اس کی یہ ادا بہت پیاری لگی۔ یہ انفرادیت اور جگہ بہت کم پائی جاتی ہے۔ مثلاً ٹیلی گراف ہل" کے بل کھاتے ہوئے موڑ توڑ ہی کو لے لیجیے۔ یہ شہر کا قدیم ترین محلہ ہے۔ جس کے ساحلی غاروں میں "گولڈ رش" کے اولین اچکے آ کر بسے تھے اور اندھیر نگری چوپٹ راج مچایا تھا۔ اس وقت یہ سان فرانسسکو کا سب سے دشوار پہاڑی علاقہ ہے۔ جس کا تنوع' بے تکا پن شہریوں کو بے حد محبوب ہے۔ اس کی بعض گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ ایک کار مشکل سے گزرتی ہے (یہ امریکہ کے لیے عجوبہ ہے' جس طرح ہمارے ہاں گنجی بازار و صرافہ بازار میں ایک گاڑے نہیں گزر سکتی) بعض گلیاں ایک دم اونچائی پر شروع ہو جاتی ہیں۔ وہاں نہ سڑک نہ موٹر۔ پیدل چلیے۔ پتھروں کو کاٹ کر قد مچے بنے ہوئے ہیں۔ ایک گلی دنیا کی سب سے ٹیڑھی گلی کہلاتی ہے۔ اس میں پانچ سو چھہتر بل ہیں۔ چلتے چلتے چکر آ جاتے ہیں۔ بچے وہاں خوب کیڑی کاڑا کھیلتے ہیں۔ اس محلے میں بھانت بھانت کے "کرخنداروں" کے شانہ بشانہ فنون کی گیلریاں بھی ہیں۔ یہاں بیٹ تک کے غول کے غول نظر آئے۔ ڈاڑھیاں' مکے' تعفن' نغمے' بے حسی' جوانی' جنسی بدنظمی' گیتا' یوگا! احتجاج! یہ ہے اس افسانوی نسل کا حلیہ۔ یہ

KitaabPoint.blogspot.com

بوہیمین بیل جو پروان چڑھتے چڑھتے نامعلوم کتنے نام اور حلیے بدلے گی۔ فی الحال "ہپ" کہلاتی ہے۔ یہ ماحول کی ناانصافی پر جہاد کرنے کی بجائے راہ فرار اختیار کرتی ہے۔ حکومتی عملے کو حقارت سے Esablishment کہہ کر رد کر دیتی ہے۔ کسی بھی آئیڈیالوجی کو "معاشرتی دروغ" قرار دیتی ہے۔ مایا کی کھوج کو چوہوں کی دوڑ کا نام دیتی ہے۔

ایک اور پہاڑی علاقہ روسی Hill کہلاتا ہے۔ اس روسی ہل کا روسیاہوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ روسیاہ کہیں اور بستے ہیں۔ اس علاقے سے تمام سمندر اور باقی پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔ اس کی بھی سڑکیں اکثر غائب ہو جاتی ہیں اور موٹر روک کر پا پیادہ چڑھائی کرنی پڑتی ہے۔

Nob Hill مخفف ہے Nabob Hill کا' جہاں پرانے زمانے کے نواب ورؤسا رہتے تھے۔ جنھوں نے یہاں اوٹ پٹانگ رنگ برنگے محل دو محلے بنا کر اس کو بھی ایک انوکھا علاقہ بنا دیا ہے۔

"پریزیڈیو" دو صدیوں تک فوجی نظام کا گڑھ رہا ہے۔ اب اس کے ایک حصے کا پارک بنا کر پبلک کے لیے کھول دیا گیا ہے۔ اس میں ایک چشمہ ہے۔ "ایل پولن" ہمارے دوست نے بتایا کہ یہاں کے اصلی انڈین باشندے اس چشمے کو افزائش نسل کی دیوی سمجھتے تھے۔ ہسپانوی عہد میں بھی اس کا پانی اسی لالچ میں پیا جاتا تھا۔ جس کی برکت سے فوجی جرنیلوں کے خاندان کبھی بارہ کبھی سولہ کبھی بیس بچوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ اب امریکی فوج نے اپنے "اعمال" گننے بند کر دیے ہیں۔

ہمارے دوست ڈاکٹر پال کی بیٹی نے ہمیں اس شہر میں مزید چکر دیے۔ اعصاب کا ڈھیر ہو گیا۔ امریکہ میں ۸۰ میل کی رفتار سے کم کار چلانے والا مجرم یا مریض سمجھا جاتا ہے۔ سان فرانسسکو کی مشہور لامتناہی شاہراہیں ایک وقت میں دس اطراف سے آ کر ملتی ہیں اور آر پار ہو جاتی ہیں۔ امریکہ کی تندرفتاری اور تندترقی کا راز یہی شاہراہیں ہیں۔ جو فولادی ڈھانچوں کی مدد سے تہہ بہ تہہ بنائی گئی ہیں۔ ان کی حرکت سے شہر اقتصادیات میں برکت ہے۔ ورنہ بے پناہ آبادی کے مدنظر ایک محلے یا کارخانے سے دوسرے مقام پر جانے میں چیونٹی کی چال چلنا پڑتا ہے۔ ان شاہراہوں پر چاروں طرف کاروں کی قطاریں دیکھ کر چکر آتے ہیں۔

تین اگر سر پر سے زناٹے سے گزرتی ہیں تو پانچ پھر پاؤں تلے سے نکل جاتی ہیں۔ ہر کار زناٹے سے اڑ رہی ہے۔ اگر کم بخت ایک اڑے تو چالیس اور لے مرے۔

امریکہ میں اول تو گرامر سے خاصا مانوس ہونا پڑتا ہے کیونکہ ہر چیز تصغیر کے برعکس تکبیر کے صیغے Superlative میں پائی جاتی ہے۔ دنیا کی سب سے اونچی عمارت' دنیا کا سب سے لمبا پل' دنیا کا سب سے امیر طبقہ دنیا کی سب سے رنگین بیوہ' دنیا کا سب

KitaabPoint.blogspot.com

سے بڑا اسینوچ' سب سے خطرناک بم' سب سے زیادہ بجٹ' غرضیکہ اعداد و شمار کی گردان سن سن کر آپ کی ساری شخصیت' آپ کا ملک و معاشرہ ایک اہم تصغیر بن کر رہ جاتا ہے۔ آپ سوچتے ہیں کہ کہاں ان دیوزادوں کے ملک میں پہنچ گئے۔

اس شہر کا اصلی ہیرو تو میں بھول ہی گئی۔ جس کی وجہ سے سان فرانسسکو عالم میں تشہیر پا چکا ہے۔ وہ ہے ''گولڈن گیٹ برج'' اس طلائی پل کے فوٹو ہر موسم میں دھوپ' کے ہر گھٹتے بڑھتے لمحے میں' ہر زاویے سے اترتے ہیں۔ واقعہ ہے کہ یہ دنیا کا سب سے حسین اور لمبا پل' انجینیرنگ اور سائنس کا کارنامہ ہے۔ لیکن جس طرح پیرس میں ''سی این'' (Siene) اور لندن میں ''واٹرلو برج'' اپنی اپنی جگہ ہے۔ تو یہ پل بھی امریکی ادب میں ایک اہم باب بن گیا ہے اور اس کی فضا کا ایک مخصوص کردار ہے۔

سان فرانسسکو اور نیویارک میں شدید قسم کی ثقافتی رقابت ہے۔ نیویارک میں ذخائر زیادہ ہوں گے۔ لیکن ذوق اس شہر میں زیادہ ہے۔ یہاں چار تھیٹر کمپنیاں ہیں۔ جب اعلیٰ آرٹ گیلریوں میں کوئی نمائش ہوتی ہے تو فٹ بال سے زیادہ بھیڑ یہاں ہوتی ہے۔ حالانکہ نیویارک کی آبادی یہاں سے دس گنا زیادہ ہے۔ لیکن ہر کونسرٹ میں ٹکٹ یہاں زیادہ بکتے ہیں۔ ٹیلیویژن پر بھی سب سے پہلے تعلیمی اور معیاری پروگرام اس شہر نے شروع کئے۔ گو اس نے ابھی تک کوئی بڑا فنکار پیدا نہیں کیا۔ لیکن فنکاروں کی جائے پناہ یہیں ہے اور کم سے کم وہ فضا رکھتی ہے جس میں آرٹ پروان چڑھ سکتا ہے۔ اس ثقافتی سبقت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس شہر میں پولس اور منصف سے پہلے لطیف ہنر داخل ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ قوانین امن و استحکام کا سبب بنتے۔ یہاں ایک خانہ بدوش تھیٹر کمپنی نے قدم جما لیے تھے۔ جہاں وہ ایک رات سرکس اور ایک رات شیکسپیئر کے ڈرامے کرتی تھی (شیکسپیئر اور سرکس! انا للہ و انا الیہ راجعون) اس پر مجھے ایک باسی لطیفہ یاد آ گیا۔ امریکہ کے صحرانورد نیم مہذب ''ٹیکساز'' کو پیسہ کمانے کا اتنا ہی شوق ہے جتنا گولی چلانے کا۔ بدقسمتی سے وہاں ایک شیکسپیئر تھیٹر جھومتا جھامتا پہنچ گیا۔ کھیل ''اوتھیلو'' (Othello) شروع ہوا۔ حاضرین کو اس قدر پسند آیا کہ چلانے لگے۔ ''ڈرامہ نویس! ڈرامہ نویس کو بلاؤ۔'' اب کس کی مجال کہ یہ فرمائش پوری نہ کرے۔ غریب تھیٹر کا مالک ہڑبڑا کر خود شکسپیر بن کر اسٹیج پر جو پہنچا تو پٹاخ سے ایک گولی اس کے سر کو لگی۔

اس کو کہتے ہیں فنون لطیفہ کی سرپرستی۔

جنوبی کیلیفورنیا کی مشہور یونیورسٹیاں ''سٹین فرڈ'' اور ''برکلے'' ہیں۔ اسی شہر کے ہرے بھرے گردونواح میں میلوں کے پھیلاؤ میں علم کی دیوی سرسوتی نے پوری گمبھیرتا سے اپنے مندر چنے ہیں۔ مجھے سٹین فرڈ یونیورسٹی سے مخصوص دلچسپی تھی۔ ایک تو اس کا یونانی تھیٹر اپنی مرمریں نفاست کے لیے مشہور تھا۔ دوسرا اس کا ننھا سا عجائب گھر۔ (یہ ''ننھا سا'' اس یونیورسٹی کے رقبے کے لحاظ سے ہے'

KitaabPoint.blogspot.com

ورنہ اس ملک میں "نتھی" کوئی چیز نہیں ہوتی)

یہاں پر دسویں صدی کا جاپانی کانسی میں "ادھی بدھا" سجا ہوا ہے۔ جس کے کشادہ چہرے پر نروان کھلا ہوا ہے۔ بہت سے بدھا دیکھے لیکن اتنا سکون کہیں نہیں دیکھا۔ یونیورسٹی کے چاروں طرف پروفیسروں کی حسین کوٹھیاں' باغ' ہمارے ہوائی کے دوست "پول حنا" بھی یہیں مقیم تھے۔ ایک سبز ٹیلے پر ان کا بنگلہ امریکہ کے مشہور معمار Frand Loyd Wright نے بنایا تھا۔ ہمیں اس معمر عالم منکسر المزاج شخصیت نے اپنا سارا گھر اندر سے دکھایا۔ ہر کمرے میں ملک ملک کے نوادر سجے تھے۔ اس کے بچے دونوں خوشحال ہیں۔ اس لیے یہ گھر غالباً قوم کے لیے عجائب خانہ بن جائے گا۔

میرا دل پھر حسرت سے بھر آتا ہے۔ تعلیم امریکہ کا غریب ترین پیشہ سمجھا جاتا ہے اور اس پر یہ ٹھاٹھ ہیں کہ ڈاکٹر پال حنا کی ایک کتاب پر ہی لاکھوں روپے رائلٹی آتی ہے۔ میرا اس حسین گھر کو چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ امریکی ناراض تھے کہ جنوبی کیلیفورنیا کی یونیورسٹیوں کے معیار بہت پست ہو گئے ہیں اور یہ علمی ادارے نہیں رہے بلکہ طلباء ساخت کرنے کے کارخانے بن گئے ہیں۔ ان یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کی بہت کم قدر ہے۔ "ہارورڈ پرنسٹن ییل" تو کجا دوم درجے کی یونیورسٹیاں بھی انہیں خاطر میں نہیں لاتیں لیکن طالب علم ہیں کہ ہماری طرح چلے آتے ہیں اور یہاں بھی کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں۔

خدا نے انسان کو جو ڈھالا ہوگا سو ہوگا۔ لیکن خود انسان نے خدا کو خوب گھڑا ہے۔ ہر ملک ہر مذہب نے اسے اپنے رنگ میں رنگا۔ اپنے پیرہن میں ڈھانپا۔ اس طرح پیغمبروں کی شخصیت معاشرے کے ساتھ ساتھ بدلتی گئی۔ افریقہ کے مسیح اور مریم کالے بھٹ۔ جاپانی بدھا نکا چپٹا اسی طرح ہر ملک نے اسلام کو نئے اوتار میں پیش کیا۔ انڈونیشیا میں پرنامی دیویوں دیوتاؤں سے ملا دیا۔ مدراس میں محرم الحرام کو دسہرہ بنا دیا۔ ایران میں تقیہ کر کے فارغ ہو بیٹھا۔ نائیجیریا' گھانا میں لوگ توہمات میں پرو دیا گیا۔ لندن میں کرسی میزوں پر سجدے ادا کیے۔ امریکنوں نے بھی اسلام کے نام پر ایک نیا سوانگ رچایا۔ ایک طبقے کا کہنا ہے کہ کیونکہ ہم سیاہ ہیں۔ ہمارا اسلام بھی سیاہ ہے اور خدا بھی سیاہ۔ یہ ہیں بلیک مسلم! ویسے تو امریکہ میں دو اور قسم کے مسلمان بھی ہیں۔ ایک احمدیہ دوسرے کلمیہ یا اسمیہ۔ یہ غلط سلط جو بھی ہوا اسلام کی خدمت کر رہے ہیں اور صرف ان میں ایثار اور تبلیغ پائی جاتی ہے۔ انہی کی جماعت اچھی طرح منظم ہے۔ سان فرانسسکو میں سب سے بڑی اکلوتی مسجد انہوں نے ہی بنوائی ہے۔ دوسرے محض کلمے یا نام کے مسلمان ہیں۔ ان کا شجرہ نسب کیلیفورنیا سے نکالو تو جا کر کیمبل پور پہنچتا ہے۔ ان میں حسب معمول عموماً پنجابی ہیں اور باقی پٹھان۔ جنہوں نے پنجابیوں کی دیکھا دیکھی وطن سے باہر روزی تلاش کی۔ گزشتہ صدی کے عین اختتام اور پہلی جنگ عظیم کے آغاز تک ان

KitaabPoint.blogspot.com

کے غول کے غول (جن میں زیادہ تر کسان اور مزدور تھے اور کچھ بھگوڑے سپاہی) لدھیانہ' رہتک اور کیمبل پور سے روانہ ہو کر ہزار دشواریوں سے چالاکیوں سے سنگاپور اور ہانگ کانگ کے راستے کیلیفورنیا پہنچے۔ کچھ سکھ شمال سے کینیڈا کے ذریعے داخل ہوئے اور امریکہ کے سب سے زرخیز صوبے میں بس گئے۔ جس کی زمین سے انہیں امید تھی کہ سونے اگلے گی اور پھلوں کے خوشے توڑے بغیر منہ آ جائیں گے۔ لیکن ان معصوموں کے لیے عرش پر بھی بیگار تھی۔ یہ سب مزدور بھرتی ہو گئے۔ کوئی تو سیب چن کر پیٹ بھرتا' کوئی ریل کی پٹڑی پر پتھر کوٹتا۔ خیر ان سب نے جفاکشی اور کفایت شعاری سے کچھ پیسہ بچایا۔ پھر ہندوستان میں آزادی کی تحریک کی شروعات اور سرگرمیاں ان کے کان میں پڑیں۔ ہردیال' موتی لال نہرو' محمد علی' شوکت علی' گاندھی کے نام سے ان کے خون میں جوش اٹھا۔ ان سے کئی خاندانوں نے گاڑھے پسینے کی کمائی کا حصہ سیاسی جماعتوں خاص طور پر کانگریس کو بھیجا۔ ہندو' سکھ پہلے پگڑیاں پہنتے تھے۔ پھر جب شرمانے لگے تو خود پہننا چھوڑ دیں بلکہ بازار میں بیچنا شروع کر دیں۔ امریکن کوئی بھی عجوبہ ہوا سے خریدنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک مسلمان فضل محمد پر خدا کا بہت فضل ہوا۔ اس نے دو ہزار ایکڑ زمین ''چکو'' میں پٹے پر لے کر آہستہ آہستہ جائیداد بنانی شروع کی۔ کہتے ہیں کہ وہ چکو شہر کی پاؤ جائیداد کا مالک بن گیا اور جب مرا تو امریکہ کا پہلا مسلم لکھ پتی تھا۔

ہندو سکھ عموماً آپس میں شادیاں کرتے تھے اور اپنی زبان پنجابی کو برقرار رکھتے تھے۔ البتہ مسلمانوں نے حسب معمول باہر شادیاں کیں۔ چراغ کی بیوی میکسیکی جس کا نام ہسپانوی' فتح دین کی زوجہ عراقی۔ تیسرے کی اطالوی' غرض کہ خوب مسلم خون خلط ملط ہوا۔ مسلمان نے نہ صرف اپنا لباس بدلا بلکہ رسوم و آداب بدل ڈالے۔ میں نے ایک شام سان فرانسسکو کی مسجد کے قریب ایک گھر میں گزاری۔ جہاں اس قسم کے خاندانوں کے کچھ افراد ہم سے ملنے خاص طور پر جمع ہوئے تھے۔ ان کی پرانی اور نئی پود میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بوڑھوں میں کچھ حجاب تھا۔ انہیں ابھی تک ''السلام علیکم'' کہنے کی عادت تھی۔ ہمارے لیے کچھ بساندہ آلو کا سالن بھی بنایا ہوا تھا۔ کچھ اسلام اور پاکستان کے لیے دبی دبی چنگاری بھی سینے میں تھی لیکن نئی نسل بالکل امریکی' بلکہ امریکنوں سے بھی زیادہ امریکی لہجہ زبردست جو صرف ناک میں ادا ہو۔ وہی بالوں کی تراش' وہی تنگ پتلون' وہی سیاسی اور تعلیمی پر چارک سے اندھا تعصب۔ ایک جوان فرماتے ہیں۔

''سب ویت نامی اور ''کورین'' لوگوں کو مار دینا چاہیے۔ ہم کہاں تک ان کو کھلاتے جائیں۔ آخر امریکہ نے ساری دنیا کو پالنے کی قسم تھوڑی کھائی ہے۔'' دوسرے بولے ''کمیونزم ایک خطرناک اژدھا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم کو نگلے۔ اس کا سر کچل دینا چاہیے۔''

KitaabPoint.blogspot.com

مجھے احساس ہوا کہ میں امریکی ٹیلیویژن دیکھ رہی ہوں۔ مجھے بتایا گیا کہ بعض درمیانی نسل کے ابھی تک کنوارے بیٹھے ہیں اور ''بڈھے چچا'' کے نام سے چھیڑے جاتے ہیں۔ان کی شادی ایک مسئلہ بن گئی ہے۔میں نے ایک ''انکل'' سے پوچھا۔ ''کیوں؟'' بولے ''شادی مسلمان ہی سے کرنی ہے۔اپنے وطن کی ہم عمر نہیں ملتی' ایرانی لڑکی تیز ہے' عراقی صرف شہریت کے حقوق حاصل کرنے کے لیے مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے اور امریکی لڑکی مجھے حقارت سے دیکھتی ہے۔''

ان میں ایک خاندان بہت دلچسپ تھا۔باپ کا نام ''نیامت خان'' بیٹے کا نام نیامتا جونیئر' بیٹی کا نام مسز لولیٹا اور مس آمنہ' یہ نیامتا سینئر ۸۰ سال کا چھپ زدہ بڈھا تھا۔جس نے تھوڑا سا کما لیا تھا کہ بڑھاپے میں اولاد کا دست نگر نہ ہو۔آج ۴۵ سال بعد بھی سگریٹ اسی انداز میں پی رہا تھا جس طرح اپنے ضلع ''انباڑے'' میں سوٹنے مار کر حقہ پیتا تھا۔کھانے کی میز پر سڑپ مار کر سوپ پینا شروع کیا تو بچے کچھ شرمندہ ہو گئے۔لیکن نیامت خان کے کان اتنے لمبے تھے کہ سڑپ سڑپ کی آواز وہاں تک غالباً پہنچتی ہی نہ تھی۔کونے میں اس کی موٹی نیم ہسپانوی بیوی بیزاری بیٹھی اپنے ضخیم صوفے سے بھی باہر بہی جا رہی تھی۔''بڈھے نیامتا سے امریکن معاشرہ دور سے بھی چھو کر نہیں گزرا تھا۔اس کا لہجہ خاص اپنے وطن ''انباڑے'' کا تھا۔گھر بالکل معمولی کوئی سالم برتن نہیں۔غسل خانے میں تعفن' لیکن باہر کار لمبی اور نئی۔بیٹیاں فراکوں میں دم کٹی بٹیروں کی طرح بالکل اینگلو انڈین کی ''مافک'' غالباً داماد پیسے والا تھا۔''نیامتا جونیئر'' قابل رحم تھا۔اسکول میں سفید امریکی' اس کے مذہب اور معاشرے پر جملے بازیاں کرتے تھے۔یہ اپنے ماضی پر سخت نادم نظر آتا تھا۔اس کا بس چلتا تو اپنے مشرقی خون کو ہسپتال میں بدلوا دیتا۔اپنے آبائی نام پر سفید چونا پھروا دیتا۔انکھیوں میں وہ اپنے ''سوٹنے مارتے'' ہوئے باپ پر شرمندہ ہو رہا تھا۔

ان مسلمانوں کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا' اگر یہاں احمدی اور عرب مبلغ نہ پہنچتے۔ان کی تنظیم کے صدقے آج نہ صرف سان فرانسسکو میں ایک مسجد ہے اور چند نمازی ہیں بلکہ ایریزونا کی یونیورسٹی میں بھی بقول ''نیامتا جونیئر'' کے ایک مسلم گرجا ہے جہاں پچاس پاکستانی طلباء اور تقریباً اتنے ہی مسلم خاندان (مع عرب کے) لیے ہوئے ہیں۔کچھ شکایات پاکستانی طلباء کے خلاف ہیں کہ وہ بدتمیز بھی ہیں اور مغرور بھی۔اور کیلیفورنیا کے مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہیں یا عربوں سے حجت کرتے ہیں۔وہاں اسلامی مرکز میں بھی باقاعدہ وعظ ہوتے ہیں۔''الانوائے'' کی یونیورسٹی کی حدود میں پہلی ستمبر کو زبردست ''مسلم کنونشن'' منعقد ہونے والی تھی۔جس میں تمام امریکہ کے مسلمان ہر نوع ہر رنگ کے اپنے واعظ اور مقرر بھیج رہے تھے۔اس شام دونو جوانوں سے اچھی بحث رہی۔ان کا کہنا تھا کہ ''اگر اسلام میں لچک نہ آئی تو یہ مٹ جائے گا۔فراک پہنے ''منگی'' ناچنے یا خنزیر کھانے سے اسلام ختم تو نہیں ہو جاتا۔'' انہوں

KitaabPoint.blogspot.com

نے مثال دی کہ حال ہی میں ''سیکرامنٹو'' کی مسجد کے ساتھ میں ایک ''سمر سکول'' برائے مذہبی تعلیم کھولا گیا ہے۔ جہاں جوانوں کے لیے ہوسٹل کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس یوتھ ہوسٹل میں امام ایک دن نیکر پہن کر لیکچر دینے آ گیا تو چند وضع دار مسلمان طلباء بگڑ گئے۔ برعکس اس کے جب اس سکول کے تالاب کے اوقات غسل لڑکیوں کے لیے الگ کر دیئے گئے تو خواتین Segregation کا نعرۂ احتجاج لگا کر اس میں مردوں کے سامنے کود پڑیں۔ یہ ہے اسلام اور نئی روشنی کی ٹکر۔

KitaabPoint.blogspot.com

نیویارک

نیویارک کو میں نے پچھلے آٹھ برسوں میں تین دفعہ بخوبی دیکھا' پرکھا اور برتا۔ جب میں نے پہلی دفعہ امریکہ کا رخ کیا تو لندن سے جہاز الاطالیہ آزمایا۔

فرسٹ کلاس بالکل خالی تھی۔ ہم پسر گئے۔ یوں احساس ہوا جیسے جہاز ہمارے لیے اڑایا گیا ہو۔ پھر ایک گٹھڑی نظر آئی۔ ایک حاملہ لبنانی عورت فضائی سفر سے خوفزدہ ابکائیوں سے زرد کونے میں بیٹھی تھی۔ میں کچھ دیر باتوں سے اس کا جی بہلاتی رہی۔ اتنے میں مشروبات آ گئیں۔ اللہ غنی! میرے میاں ٹائی سیدھی کر کے اجاگر ہو گئے۔ مفت کی ان جیسے مولوی کو بھی حلال ہے۔ انہیں خیر سے نئے نئے تجربوں کا بہت شوق ہے۔ اپنی نوٹ بک نکالی اور ہر رنگ کی بلوریں تاب چکھتے جائیں اور اس کو نمبر دیتے جائیں۔ دیکھتے دیکھتے ورق بھر گیا اور میاں غین ہو گئے۔ ادھر کھانا آ رہا ہے۔ ادھر جناب خراٹے لے رہے ہیں۔ بہت مشکل سے اٹھایا۔ کھانا کیا تھا۔ ایک طعامی ہنگامہ تھا۔ انواع جب زیادہ ہوں تو میری بھوک غائب ہو جاتی ہے۔ میرے میاں نے سوچا کہ جہاز کی اطالوی حسین میزبان خاتون سے اطالوی چھانٹی جائے۔ لہجہ بنا کر بولے۔ Aqua Minerale

اس غریب کو ان کی اطالوی تو پلے نہ پڑی۔ ستھری انگریزی میں بولی۔

Do You want mineral water?

میرے میاں جب کچے ہو جاتے ہیں تو میری طرف نہیں دیکھتے کیونکہ میری ہنسی چھوت کی بیماری کی طرح جب ان کو لگے تو پھر وہ خود رک سکتے نہیں۔ اتنا ہنستے ہیں کہ اچھو لگ جاتا ہے اور میں اپنی ہنسی بھول کر ان کی پیٹھ پر دھموکے دیتی ہوں۔

چھ گھنٹے اطالوی عیش کے بعد جیٹ نیویارک پر منڈلانا شروع ہوا۔ پائلٹ جان کر چکر دے رہا تھا کہ ہم نیویارک کا رت جگا مکھڑا اچھی طرح دیکھ سکیں۔ کوسوں دور تک منور زینے آسمان پر چڑھتے چلے گئے۔ یہ نیویارک' امریکہ کا دروازہ۔ امریکہ کا اولین تعارف اس کے معاشرے کا مخصوص نمائندہ ہے۔ نہ جانے اس وقت کیوں یہ دعا نکلی۔

"یارب! انسان کو اس مزین معاشرے کی تباہی سے بچا لے۔ جس کو اس نے صدیوں کی تگ و دو کے بعد اس معراج پر پہنچایا۔ کس جتن سے کس کاوش سے انسان یہ کرشمے آباد کرتا ہے اور پھر کس بیدردی سے ان کو تباہ کر دیتا ہے۔ تیسری عالمگیر جنگ میں اگر

KitaabPoint.blogspot.com

نیو یارک کے یہ فولادی فرعون گرے تو دم پخت انسانیت کہاں جائے گی؟"

ہوائی جہاز اتر رہا تھا اور میرے خیالات کی ہولنا کیوں میں مخلص عبادت پنہاں تھی۔ پہلی دفعہ ہمارا نیو یارک سے تعارف کا شگون کچھ نیک نہ نکلا۔ سوائے موسم کے اور کسی چیز نے ساتھ نہ دیا۔ کفایت شعاری کے مدنظر زیر زمین ٹرین سے سفر کیا تو ٹیوب اسٹیشن ایسے معلوم ہوئے گویا تاریک بھیانک زنداں۔ پھر طرح طرح کے نمونے آپ کے پیچھے سیٹی بجاتے اور آوازیں کستے ہیں اور دفتروں کے اوقات بعض اسٹیشن بالکل ویران ہوتے ہیں۔ مجھے لندن کی کسی ٹیوب میں ڈر نہ لگا۔ رات گیارہ بجے اکیلی آتی جاتی تھی۔ ماسکو کے تو ٹیوب خیر مرمریں محلات ہیں۔ لیکن پہلی دفعہ نیو یارک میں میری سٹی گم ہوئی اور توبہ کی کہ آئندہ ٹیکسی لوں گی۔

مختلف اوقات پر بازار میں ایک بار نہیں تین بار پیچھے راہ چلتے مرد نے ٹھوکا دیا۔ "میرے ساتھ چائے پیو گی؟" یا اس قسم کا مہمل سوال۔ سنٹرل پارک میں گئی سیر کرنے تو اسی دن مجھ سے پہلے کسی افریقہ کے سفیر کا بٹوہ دن دہاڑے پستول دکھا کر چھین لیا گیا تھا۔ لعنت اس پارک پر۔ ڈر کے مارے واپس لوٹی اور حسرت سے لندن کے پارک یاد کرتی رہی۔

۱۹۶۰ء کا بہترین ڈرامہ Toys in the Attic چل رہا تھا۔ سب سے آخری نشست کا ٹکٹ پانچ ڈالر کا لیا 'طوعاً کرہاً' اور نہ صرف اپنا بلکہ دوستوں کا بھی۔ اور سارے وقت ۲۰ ڈالر کو پانچ روپے سے دل ہی دل میں ضرب کھاتی رہی اور پھر ڈرامہ بھی وہ کہ سوائے چیخ و پکار اور جرم اور نفسیاتی اختراع کے اور کچھ نہیں۔ یوں لگا کہ "للین ہیملن" ڈرامہ نویس نے "اگلے تھا کرسٹی" اور "ٹینیسی ولیم" کو ایک کٹورے میں ڈال کر خوب ہلایا اور جو مرکب نکلا۔ اس کا یہ کھیل گھسیٹ ڈالا۔ اگر انگلستان اور یورپ اپنے بہترین تھیٹر یہاں نہ بھیجے تو "براڈوے" سر کے بل بیٹھ جائے۔ خیر پھر "ریڈیو سٹی ہال" کا شو بھی دیکھا جو ہر سیاح کے لیے فرض ہے۔ جتنی بتیاں اتنی اتنی پیاری پیاری نسوانی لاتیں! لیکن کوئی خاص بات نہ بنی۔ اس سے بہتر تو جاپان کے شو ہوتے ہیں۔ جن میں ایک جدت ایک نفاست ہوتی ہے۔

اگر مجھے اس دفعہ کوئی چیز بھائی تو "گرینج ولج" یہاں پر کچھ نئی فضا' نئی انفرادیت محسوس ہوئی۔ بعض داڑھیاں البتہ کرائے کی معلوم ہو رہی تھیں۔ جس سے شک ہوا کہ یہ بھی سیاحوں کے لیے ایک مزید پھندا ڈالا ہے۔ یہاں کے ریستوران اور تھیٹر دونوں سستے بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔

مجھے چونکہ باقی امریکہ دیکھنے کا شوق تھا۔ اس لیے سراکیوز روانہ ہو گئی جو میرے لیے امریکہ کا سب سے خوشگوار تعارف ثابت ہوا۔ بہرحال نیاگرا' شکاگو' واشنگٹن کا چکر کاٹ کر پھر نیو یارک پہنچی۔ اب کے اطمینان سے رہی۔ خوب گھومی۔ خوب خاک چھانی۔

KitaabPoint.blogspot.com

لیکن پھر بھی اس بے ہنگم شہر کی سمجھ نہ پائی۔

نیویارک ایک بے سروپا دیو ہے۔ یہاں پہنچتے ہی انسان بوکھلا جاتا ہے۔ یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ شہر ہم جیسے انسانوں کے لیے بنا ہی نہیں۔ یہاں تجارتی مشینیں' کاروباری کارندے' اشتہاری پرزے اور سیاسی بہروپیے رہتے ہیں۔ یہاں پارک ''ایونیو'' کی کثیر امارت ''ففتھ ایونیو'' کی جلوہ گریاں اور ''ہارلم'' کی حبشی محرومیاں بستی ہیں۔ اس کے عمارتی اور فنی کارنامے بیان کیے جائیں تو انسانی سعی کا قصیدہ مرتب ہو جائے گا۔

اس کے ہزاروں باسیوں نے کبھی سورج کی شکل نہیں دیکھی۔ وہ زیر زمین ٹرین سے آئے زیر زمین دفتروں میں کام کیا۔ وہیں کھایا پیا اور وہیں سے شام کو لوٹ گئے۔ اس نیویارک کی نسلی کھچڑی کا یہ کہنا ہے کہ یہاں روم سے زیادہ اطالوی رہتے ہیں۔ کیو سے زیادہ روسی' ڈبلن سے زیادہ آئرش' اسرائیل سے زیادہ یہودی اور ''سین اوان'' سے زیادہ پورٹورکن مقیم ہیں۔ اس شہر کی ''امریکی'' زبان کا ''بادشاہی انگلش'' سے مطلق کوئی تعلق نہیں۔

اس لیے اس کے متعلق ایک لطیفہ مشہور ہے کہ دو سو سال ہوئے فیصلہ ہوا تھا کہ انگریزی امریکہ کی قومی زبان ہو۔ ابھی تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ اس فیصلے پر عمل کیوں نہیں ہوا۔ سوائے تاریخ کے نیویارک کی کوئی چیز پست قامت نہیں ہے۔ بھلا ہو ایک ڈچ جہاز ران ہڈسن کا۔ جس نے مشرق کا راستہ کھو کر نیویارک دریا کو پا لیا اور اب یہ دریا اس کے ہی نام پر ہے۔ اس کے دہانے پر ایک ننھا سا جزیرہ ''من ہیٹن'' جسے ڈچ نے انڈین باشندوں سے کل ۲۴ ڈالر میں خرید لیا اور اس کا نام ''نیو ایمسٹرڈیم'' رکھا اور اپنا پرچم گاڑ دیا۔ اللہ غنی! آج اسی جزیرے میں ایک کتے کی غذا پر ۲۴ ڈالر خرچ ہوتے ہوں گے۔

سترہویں صدی میں جب انگریزوں نے اس کو فتح کیا تو اپنے شہزادے ڈیوک آف یارک کے نام پر اس کو ''نیویارک'' کا لقب دیا۔ کچھ سال بعد ڈچ نے پھر اس پر قابو پا لیا۔ لیکن جاوا سماٹرا کے بدلے میں انگریزوں کو جزیرہ واپس کر دیا۔ کہاں جاوا' کہاں نیویارک' ڈچ سر پکڑ کر روتے ہوں گے۔ نہ یہ رہا نہ وہ رہا۔ اور اصل میں آہ وزاری تو کرتی ہوگی۔ اس انڈین کی روح جس نے اسے ۲۴ ڈالر میں بیچا تھا۔

واشنگٹن سے پہلے نیویارک امریکہ کا دارالسلطنت تھا۔ جہاں اس کے پہلے صدر نے حلف اٹھایا تھا۔ اس شہر کا میری رائے میں تو تاریخی سنگ میل ایک ہی ہے اور وہ ہے اولیس ایلی ویٹر کی آمد۔ جس نے ۱۸۵۷ء میں ہماری طرح غدر مچا دیا۔ اس کا آنا تھا کہ شہر اپنے سر کے بل ابھرنا شروع ہوا اور ستاروں سے سرگوشیاں کرنے لگا۔

KitaabPoint.blogspot.com

جتنا اس شہر پر من برساتی ہی ثقافت کی درآمد ہوتی گئی۔ اب اس کو "کائنات کو چک" کہتے ہیں۔ اس میں کیا نہیں ملتا؟ "آپرا' تھیٹر' شبینہ کلب' ڈسکو تھیک' فیشن کے تجربہ گاہیں' فنون کے "سلون" آف "براڈوے" آزاد انفرادیت کے نقارخانے۔ نیویارک کو امریکہ کا "بیٹ نک" شہر بھی کہتے ہیں۔ بقیہ شہر اس پر رشک کرتے ہیں اور پھر بھی ظاہر یہ کرتے ہیں کہ گویا اس سے متنفر ہیں لیکن چوری چھپے اس کی تقلید بھی کرتے جاتے ہیں۔ مجھ سے اکثر امریکن دوست اور ملاقاتی خاص طور پر مغربی ساحل پر پوچھتے تھے۔ "آپ نے کون سی خاص بات نیویارک میں دیکھی جو اتنا وقت ضائع کیا۔ نیویارک تو امریکہ نہیں۔" میرا تو سوال ہے "پھر امریکہ کدھر ہے؟" میری نظر میں تو "یانکی معاشرے" کا سب سے مستند پرچم بردار نیویارک ہے۔

اس شہر کے تضاد بھی انوکھے ہیں۔ نہ امارت سنبھالی جائے نہ غربت۔ اس شہر کے میئر لنڈسے کا کہنا ہے کہ نیویارک کو پیٹر پین کومپلیکس ہے۔ یہ پختگی سے کتراتا ہے۔

یہاں ہر وقت توڑ پھوڑ چل رہی ہے۔ نقشے بنتے اور بگڑتے ہیں۔ ایک اور چیز کا یہاں احساس ہوا۔ وہ ہے وقت۔ گھڑیاں' گھنٹیاں' جنتریاں' سب پریشان ہیں' اس آمریت سے۔ وقت سکڑ کر یہاں تولوں' ماشوں اور رتیوں میں بکتا ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ وقت بلیک مارکیٹ میں بھی بکتا ہوگا۔ کیونکہ اس کی یہاں سخت کمی ہے۔ جس کو دیکھو سانس پھولا ہوا بھاگ رہا ہے۔ آج کا نیویارک نہایت غیر آرام دہ ہے۔ میں نے اس کے سرد و گرم دیکھے ہیں۔ اندر کمروں میں سارے وقت مصنوعی موسم برقرار رکھے جاتے ہیں۔ اتنی ٹھنڈک' نتیجہ یہ کہ گرمی میں اندر آپ کو نمونیا ہو جائے اور سردی میں اندر اتنا گرم کہ پسینے چھوٹ جائیں۔ سڑکوں پر خاصی غلاظت اور مکھیاں' مہنگے' منک کوٹ' میں امیر عورتیں کھلے گڑھوں سے بچتی' کوڑے کرکٹ سے کتراتی' ایئر کنڈیشنڈ کاروں میں جا کر بیٹھ جاتیں۔ یہ تضاد بھی عجیب ہے۔ میونسپل کمیٹی غریب ہماری بے بس ہے۔ دن دہاڑے یہاں چوری اور قتل و غارت ہوتے ہیں۔ آپ کسی دوست کے فلیٹ میں گھنٹی بجایئے تو وہ دروازہ نہیں کھولتا بلکہ ننھے سے مخصوص سوراخ سے جھانک کر پہلے آپ کو جانچتا ہے۔ ہمارے ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ وہ اب سواریوں کے بیچ میں گولی سے بچنے کے لیے بلیٹ پروف شیشے لگوا رہا ہے۔ میرے خیال میں نیویارک مغرب کا سب سے عشرت پسند سانحہ کدہ ہے۔

نیویارک کا پانی کھاری اور موسیقی فراری قسم کی ہے۔ ہوائی جہاز' دکان' موٹر' سکول' کارخانہ' عجائب گھر' غالباً قبرستانوں میں بھی ٹرانزسٹر چل رہے ہیں اور سارے وقت دھیمی دھنیں بج رہی ہیں۔ یہ موسیقی ایک صوتی چکنائی کی طرح کان میں بھری رہتی ہے تاکہ بقیہ شور اس پر پھسل کر گر جائے۔ قبرستان پر یاد آیا کہ امیروں کو اگر مرنا ہے ہو تو امریکہ جا کر اپنے کو بک کرائیں۔ وہاں موت بھی ایک

KitaabPoint.blogspot.com

فنکارانہ بزنس ہے۔ مشہور ادارے صرف امیروں کے جنازے سجانے اور ان کے سر اور پیر میک اپ سے سنوارنے کے لیے زبردست اشتہار بازی کرتے ہیں۔ جس کا خاکہ ایک انگریز مزاح نگار نے یوں اڑایا ہے۔

''ایسا جنازہ جس پر آپ خود پھڑک جائیں۔''

ایک اشتہار یوں لکھتا ہے۔

''آپ ہمارے پاس آیئے' ہم آپ کو بہتر گاڑیں گے۔''

اس دفعہ چونکہ ہم نے امریکہ کا سفر ہر رخ ہر پینترے سے کیا۔ تو نیویارک ہمارا آخری پڑاؤ تھا۔ نیوارلین ڈٹروٹ شکاگو سموکی پہاڑ۔ ٹینسی ویلی پروجیکٹ بولٹن کا چکر کاٹ کر واشنگٹن پہنچے۔ دعوتیں اور سیریں ہو رہی تھیں کہ کشمیری محاذ کی خبریں پہنچنا شروع ہو گئیں۔ طبیعت پر ہلکا سا بوجھ آ گیا۔ نیویارک میں میرا دیور ''یو این'' میں تھا۔ اس کے فلیٹ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ بچے نیویارک کے لیے بے تاب تھے۔ لیکن ہم نے سوچا کہ پہلے انہیں نیاگرا آبشار دکھا دیں۔ ہماری نئی کار اسی دن سات ہفتے کی مایوں کے بعد گیراج سے نکل کر آئی تھی۔ اس کو بھی چلانے کا شوق تھا۔ ہمارے عزیز امریکی دوست کارل شمتھ جو سرا کیوز یونیورسٹی کے معزز پروفیسر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں امریکہ کے مشہور ''ہزار جزیرے'' دکھانے کا وعدہ کیا تھا جو نیاگرا آبشار کے راستے میں آتے ہیں۔ ہم سب ہنستے گاتے دو سو میل پر پہنچے۔ ان کا ذاتی نیا بنگلہ ''سینٹ لارنس'' جھیل کے ساحل پر بننے والا تھا۔ نہایت پر فضا مقام تھا۔ وہاں پر انہوں نے ہمیں پکنک لنچ دیا۔ وقت کی کمی تھی اور ان جزائر کو دیکھنے کے لیے فرصت چاہیے تھی۔ اس کے علاوہ ہم اتنے جاذب قدرتی مناظر دیکھ چکے تھے کہ ان میں کوئی بات نظر نہ آئی۔ اس رات ہم ٹھہر کر دوسری صبح نیاگرا آبشار پہنچے۔ اس آبشار کے دو رخ ہیں۔ جب امریکن رخ سے دیکھیں تو دھوبی گھاٹ معلوم ہوتا ہے لیکن کینیڈا کی طرف سے آبی حسن کا سامراجی رعب' اور اس پر پھولوں اور صفائی نے مزید نکھار پیدا کر دیا ہے۔ ویسے بھی نیاگرا میں پہلے دیکھ چکی تھی۔ جب تک نیچے کشتی Maid of the Mist میں نہ جاؤ۔ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ دنیا کی سب سے چوڑی آبشار ہے۔ نیچے اس کے پیروں میں جا کر روانی اور طاقت کا پتہ چلتا ہے۔ ہم نے جونہی چونگی پر اپنی کار کا ٹکٹ لیا تو کھڑکی کے پیچھے کینیڈین بولا۔ ''آپ کو معلوم ہے' ہندوستان نے لاہور پر حملہ کر دیا ہے۔''

یا اللہ خیر! محسوس ہوا کہ کسی نے روح سلب کر لی ہے۔ میں تو وہیں کار میں بیٹھی رہی۔ کس کی سیر اور کہاں کی آبشار...... بچوں کو ریاض صاحب جلدی جلدی پھرا لائے۔ یا اللہ لاہور میں اس وقت کیا حشر ہو گا۔ رشتے داروں' عزیزوں اور دوستوں سب کی شکلیں نگاہوں کے سامنے آ گئیں۔ پھر اپنے مانوس علاقے ماڈل ٹاؤن' جی او آر یاد آ گئے۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یارب! کیا ان کی

KitaabPoint.blogspot.com

سڑکوں پر سکھ ٹینک چلائیں گے۔ دعا مانگ مانگ کر زبان خشک ہوگئی۔ تیسرے پہر ہم مارم مارروانہ ہوئے۔ صرف ڈنر کے لیے بیس منٹ کا وقفہ کیا۔ ورنہ مسلسل پانچ سومیل تک ریاض صاحب نے کار چلائی۔ رات کے دو بج گئے اور نیویارک ابھی بہت دور تھا۔ ان کو ہلکی سی نیند آنے لگی تو فرمائش ہوئی کہ گاؤ ورنہ میں اونگھ گیا تو حادثہ ہوجائے گا مجھے تو آرام میں بھی نیند کم آتی ہے۔ اس غمگین حالت میں نیند کہاں آتی۔ چمگادڑ کی طرح چاق و چوبند بیٹھی تھی۔ تین گھنٹے متواتر گایا۔ ہر راگ' غزل' گیت جو یاد تھے' سنا دیے تاکہ میاں صاحب کی آنکھ نہ لگ جائے اور ہم بے جنگ شہید نہ ہوجائیں۔ ایک ننھی سی زندگی کے لیے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ پانچ بجے تڑکے نیویارک پہنچے۔ اسی اثنا میں بی بی سی نے لندن کے ہندوستانی ہائی کمشنر کے دام میں پھنس کر سرکاری خبر سنا دی کہ لاہور نے ہتھیار ڈال دیے۔ اگر میرا دیور مجھے یقین نہ دلاتا کہ یہ قابل اعتماد خبر نہیں ہے اور ہم اپنے تار کا انتظار کر رہے ہیں تو میں شاید بیہوش ہوجاتی۔ دماغ سوچ سوچ کر سن ہو چکا تھا۔ سب سیریں اور کھایا پیا نکل گیا۔ بچیوں کو ہم نے وہیں چچا اور دادی کے پاس چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ جوان لڑکیاں جنگ میں کہاں لے جائیں۔ میں نے اس دن ذرا آرام کر کے بچیوں کو "میٹروپولیٹن میوزیم" کی چیدہ چیدہ چیزیں جلدی سے دکھائیں۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میرے پیچھے یہ سب جگہ جائیں گی مگر عجائب گھر نہیں جائیں گی۔ شکر ہے کہ یہ بہت محفوظ ہوئیں۔ واقعہ ہے اس عجائب گھر میں یونان کے باہر یونانی' پیرو کے باہر پیروین' جاپان کے باہر جاپانی اور مصر کے باہر مصری خزانوں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے البتہ وہاں اپنے مغلیہ عہد کے نمونے دیکھ کر دل میں ٹیسیں اٹھیں۔ بابر کی مرصع تلوار' عہد اکبری کے زیورات' جہانگیر کا جام زبرجد' اس انگوری پتھر کو تراش کر کیریاں اور گلاب بنائے ہوئے تھے۔ جن میں مئے ناب ڈال کر یہ بادشاہ اپنی شام کی عبادت شروع کرتا تھا۔ اسی عہد کا ایک ریشمی قالین جن کے ایک انچ مربع میں ۲۲۵۰ پھندنے! ایک قالین پر اوندھے سیدھے انسان جانوروں میں لپٹے ہوئے اور جانور خود اوٹ پٹانگ بنے ہوئے تھے۔ گویا سولھویں صدی کا مغلیہ عہد آج کے پکاسو کی پیش روی کر رہا ہے۔ یا حسرت یا نصیب! ہمارے عجائب گھر خالی پڑے ہیں اور ہمارے خزانے بیرونی ممالک میں سجے ہوئے ہیں۔

تیسرے پہر میں نے کچھ ضروری تحفے خریدنے کے لیے بازار کا رخ کیا۔ نیویارک کی دکانیں سجاوٹ اور فراوانی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ دنیا کا سب سے ستا کپڑا یہاں سے لے لو۔ بہرحال مجھے اس وقت جلدی تھی۔ میں تحفے لینے مصنوعی زیورات کی دکان میں گھس گئی۔ گھستے ہی چالاک دکاندار کہنے لگا۔ "آپ نے سنا' پاکستانی ہوابازوں نے دلی کی پارلیمنٹ پر حملہ کر دیا اور شاستری وہیں ہلاک ہوگیا۔" مجھے جو ہول آیا تو فوراً واپس باہر آئی۔ کار کا ریڈیو لگایا مگر ایسی کوئی خبر نہ تھی۔ اس دکاندار نے جھوٹ کیوں بولا۔ پھر عقل میں آیا کہ اس یہودی کی اولاد کو بیوپار کرتے کرتے اتنی تمیز ہوگئی کہ عموماً سرخ بندی والی ہندو اور غیر بندی والی مسلمان عورت ہوتی

KitaabPoint.blogspot.com

ہے۔اس نے مجھے دیکھتے ہی خوش کرنے کی کوشش کی۔اس کا خیال تھا کہ میں شاستری کی موت کی خبر سن کر خوشی سے ناچوں گی اور خوب زیورات خریدوں گی۔ یہاں الٹا ہی اثر ہوا۔ چاہے کتنی ہی خصومت کیوں نہ ہو۔ہم ایک دوسرے کے لیڈروں کے مرنے پر کیسے خوش ہو سکتے ہیں۔کوئی میں جن سنگھی تو تھی نہیں کہ گاندھی کے امر ہونے پر لڈو بانٹتی۔لیکن یہ امریکی یہودی ایشیا کی آگ میں اپنے ہاتھ سینکنا چاہتا ہے۔کوئی مرے اس کا سودا بکنا چاہیے۔

دماغ اتنا ماؤف ہو چکا تھا کہ یہ بھی یاد نہ رہا کہ نیویارک میں عالمی میلہ چل رہا ہے جس کے دیکھنے کا مجھے ڈیڑھ سال سے ارمان تھا۔میں نے ریاض صاحب سے کہا کہ ''آپ کو جلدی ہے آپ جایئے میں تین دن بعد آؤں گی۔ورنہ ارمان رہ جائے گا کہ اتنی دور اتنا پیسہ خرچ کر کے آئی اور ورلڈ فیئر بھی نہ دیکھا۔'' یہ مان گئے۔

''نیویارک کا عالمی میلہ''

امریکہ اشتہار بازی میں تو ماہر ہے اور دوسرے ممالک کو بھی اس ہنگامی مشغلے پر مدعو کرتا ہے۔بین الاقوامی میلہ دو سال کے لیے لگایا گیا۔جس کے اکلوتے کارکن وبانی صفت موسیٰ تھے 'مسٹر موسس۔ان حضرت سے اتنا بڑا دردسر سنبھالا نہیں گیا۔کئی چیزوں میں اندھیر مچا ہوا تھا۔لیکن ہاتھی مر کے بھی سوا لاکھ کا۔میں نے یہ عالمی میلہ اپنے اختتامی موسم میں ۱۵ ستمبر کو دیکھا۔جبکہ بیرونی سیاح کروڑوں کی تعداد میں دو سال پہلے دیکھ چکے تھے۔اس کو ہماری زبان میں ''میلہ'' کہنا ظلم ہے۔ہمارے بیساکھی اور چراغاں کے میلے کہاں اور کہاں یہ!ایک الگ دنیا آباد تھی۔جن تک پہنچنے کے لیے ٹرین سے دو گھنٹے' کار سے تین گھنٹے اور بجلی کا پٹرے سے آدھا گھنٹہ لگتا تھا۔عجیب پر فضا مصنوعی اشتہاری شہر لگایا گیا تھا۔یہاں ۶۵ ممالک کے شاندار پرچم ان کی عمارات پر لہرا رہے تھے۔سب کا ذکر بیکار ہے۔صرف چھ قابل تحسین تھے جن میں سے دو حسین ترین مسلمان ممالک اردن اور انڈونیشا کے تھے۔یہ دلچسپ معرکہ تھا کہ یہودیوں کے گڑھ میں دو اسلامی ممالک نے بین الاقوامی اشتہار بازی میں اول نمبر پائے لیکن حسب معمول بلکہ حسب امید انڈونیشیا کی صفت موسیٰ سے آتے ہی جنگ ہو گئی اس لیے اس کے وجیہہ ''پویلین'' پر جو بالی مندر کی طرح بنا ہوا تھا۔تالے پڑ گئے۔ ہم صرف اس کے ظاہری نکھار اور جاوا کے مجسموں کو سراہ سکے جو اس کے باغوں میں ایستادہ تھے۔

جورڈن نے اپنی عمارت کی بیرونی چھت پر ریت کے ٹیلوں کی طرح اونچے نیچے گنبد بنائے تھے جو دھوپ میں ریت کی طرح چمکتے اور رات کو فانوس معلوم ہوتے۔اندر سے طرز زیبائش اور بھی شائستہ اس ملک کی مصنوعات قابل دید۔اس کے قلم اس کے شیشے کتاب سب بے حد مزیدار تھے۔جب باہر نکلنے لگے تو دروازے پر جلی حروف میں کھدا ہوا تھا۔''ذرا توقف کریں' اور پھر انسان کے

KitaabPoint.blogspot.com

ضمیر سے استدعا تھی' عرب مہاجرین کے لیے۔ پڑھ کر میں بے ساختہ رودی۔ مظلوم کی آہ میں کتنا اثر' کتنا خلوص ہوتا ہے۔ سنا ہے یہودیوں نے اس کندہ درخواست پر بہت احتجاج کیا۔ لیکن قانونی طور پر ''پویلین'' کے اندر پوری آزادی تھی۔ اگر یہ آزادی نہ ہوتی تو چین کے سہ طرفہ پر جمال ''پویلین'' میں سلیوڈورڈالی'' کا زبردست ''میورل'' کیسے ہوتا۔ جس کی سرخی تھی۔ ''ڈالر کی فتح'' اور اس فتح کا نتیجہ کینوس پر دکھایا گیا تھا کہ ایک انسانیت کرب میں مبتلا ہے۔ بھوکے ننگے بچے مزدوروں کے شکستہ اعضاء بھیڑیے اور آدمی کی متشابہ اشکال۔

چین نے ناچ رنگ میں سب کو مات کر دیا۔ صبح شام لوگ گیتوں اور ناچوں کی مفت نمائش' سیاہ اور سرخ لباسوں میں پری چہرہ دوشیزائیں اور دمکتے ہوئے جوان گھنٹوں ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے تھے اور دل نہیں بھرتا تھا۔ ہسپانوی موسیقی میں ویسے بھی سحر انگیز جاذبیت ہے۔ پھر ان کا خانہ بدوش رقص جو سیول (Saville) کی موری ''مینوایلا'' ہر شام اپنے مخصوص لباس میں دکھاتی تھی۔

بلجیئم نے اپنا اصلی روایتی گاؤں کا گاؤں آباد کیا ہوا تھا۔ جہاں اس کے ہیرے جواہرات اور صنعتی ہنر کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ ہندوستان کا ''پویلین'' قابل ستائش تھا اور پھر کیوں نہ ہوتا' اندرا گاندھی نے دو سال قبل اس کی تیاری کے لیے کمیٹی بٹھائی ہوئی تھی اور خود پہلے جا کر دو دفعہ معائنہ کر چکی تھی۔ محنت کا پھل ہر ایک کو ملنا چاہیے۔ ہندوستان نے نمائش تین منزلوں میں پھیلائی تھی۔ پہلی پر ماضی' دوسری پر حال اور تیسری پر مستقبل کے لیبل لگے تھے۔ ماضی میں تاریخ کا ورثہ دکھایا گیا تھا۔ ہم عصر دور کی ٹیکسٹائل اور فولادی مشینیں' آزادی کا ڈرامہ اور ہندوستان کی مایہ ناز دستکاریاں۔ تیسرا تختہ ''آئندہ'' تو خیر ایک قیاس آرائی تھی جو پوری بھی ہو سکتی ہے بشرطیکہ ہندوستان غذائی اور صوبائی مسائل حل کرے۔

ہندوستان کے پویلین میں ایک مہذب عورت مل گئی جس نے ہمیں سب اشیاء سلیقے سے دکھائیں۔ اسی شام چین نے ہندوستان کو الٹی میٹم دیا تھا اور جب جنگ کا ذکر چھڑا تو عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولی ''پاکستانی ہندوستانی تو بالکل ایک جیسے ہیں' اگر چینی آ گئے تو ان کو معلوم کیسے ہو گا کہ کون ہندو ہے کون مسلمان۔'' میں نے کہا ''اگر ہندوستان نے پہلے ہی یہ گر سمجھ لیا ہوتا تو پاکستان بنتا ہی کیوں! پاکستان ہندو کی تفرقہ پردازی کا اعلانیہ ثبوت ہے۔''

اس کے بعد پاکستان کے پویلین کا ذکر ہی نہ کروں تو بہتر ہے۔ جو وہاں تھا اس کی امید پہلے سے تھی۔ کیونکہ صرف چار مہینے پہلے بھگدڑ میں ایک کمیٹی بنائی گئی۔ مجھے مدعو کیا گیا کہ اپنی رائے دوں۔ میں نے پہلا سوال کمیٹی کے چیئرمین سے کیا۔ ''آپ اس پویلین پر کتنا خرچ کرنا چاہتے ہیں؟'' انہوں نے بتایا۔ ''سوا دو لاکھ جس میں سے دو لاکھ وہیں نیو یارک میں پویلین کی آرائش و تیاری میں

KitaabPoint.blogspot.com

خرچ ہوگا اور باقی پچیس ہزار ہم نے جہاز میں سامان کے لیے وقف کر دیا ہے۔'' میں نے وہیں دعائے مغفرت پڑھ کر اپنی مصروفیات کی بنا پر معافی و رخصت چاہی۔

عالمی میلے میں اپنا اسٹال دیکھ کر بے بسی سے رونا آ گیا۔ اگر ہمارے پاس کچھ قابل ستائش ورثہ نہ ہوتا تو شاید صبر آ جاتا۔ لیکن اب کیسے صبر کیا جائے۔ جب ہم نے جان توڑ کر سختیاں جھیل کر پچھلے پانچ سال میں ایک پندار سا پیدا کیا۔ ایک فخر سا حاصل کیا۔ اسی دستی میراث میں جسے لوگ بھولتے جا رہے تھے۔ صرف میرے چھوٹے سے مرکز نے سارے ہندوستان اور پاکستان میں پہلی دفعہ موہنجوداڑو اور ٹیکسلا کے ۳۳ نمونے جو بہت مقبول ہوئے چاندی۔ تانبے پیتل میں بنائے تھے۔ بدھ سٹوپا کے حسین لیمپ جن کو ایک ''سینئر'' بیگم نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ نمائش میں یہ نہیں جا سکتے یہ ہندو ہیں۔ سب سے زیادہ محبوب ہوتے۔ اول تو یہ سٹوپا ہندو نہیں اور بالفرض محال اگر ہیں بھی تو ہم اپنی تاریخ سے کیسے گریز کر سکتے ہیں؟

بحث ہمیشہ فضول ہوتی ہے اور میں تہی دماغ ظلمت پسندی کے سامنے ہمیشہ گردن جھکا دیتی ہوں۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ پاکستانی پویلین کی عمارت کا اسلامی تاریخ و معاشرے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کسی بدنما چاردیواری پر سبز گنبد اگانے سے عمارت اسلامی معاشرے کی نمائندگی نہیں کر سکتی۔ پھر جس امریکن ماہر نے یہ عمارت ترتیب دی۔ اس نے ضرور پیسے کھائے اور کھلائے۔ نمائشی الماریاں اس طرز پر بنائی تھیں کہ ان کا صاف ہونا محال تھا۔ مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اندر دس پیاری پیاری جوان لڑکیاں بنی بنی کھڑی تھیں۔ ان گڑیوں کی ٹریننگ اور تنخواہوں' کرایوں پر ایک لاکھ خرچ کیا گیا' لیکن ان کا فائدہ؟....... یہ عالمی میلہ پاکستانی کے نسوانی حسن کی نمائش تو تھی نہیں' وہ بیچتیں کیا؟ سوائے گل جی کے مرمریں میورل کے جو قابل ذکر تھا۔ وہاں مٹی سے لدے قالین (جو چیزیں صاف ہو سکتی تھیں وہ بھی نہیں کی گئیں) کانچ کی چوڑیاں' بوسیدہ ساڑھیاں اور ملتان کے اونٹ کی کھال کے وہ لیمپ جو اپنے ملک میں بھی نہیں بکتے' سجے ہوئے تھے۔ باقیماندہ سامان بندرگاہ کے گوداموں میں پڑا تھا۔ کمیٹی کا پیسہ ختم ہو گیا تھا کہ اس کو چھڑائے۔ باہر ہوٹل فاروق کے تکے بک رہے تھے وہ بھی بدمزا' کوا چلا ہنس کی چال' اپنی بھی بھولا۔ جن مسالوں پر سفید قومیں مرتی ہیں۔ یہاں سرے سے غائب تھے۔ اگر انہیں پھیکے تکے کھاتے تھے تو اپنے ''روسٹ'' ہی کیوں نہ چباتے؟

خیر خود امریکہ نے اس نمائش میں جو اپنی صنعتی اور ٹیکنولوجکل ترقی کا مظاہرہ کیا۔ اس کی کون ٹکر لے سکتا تھا؟ ''سٹینڈرڈ جرسی'' سے لے کر جنرل موٹرز تک وہ دس عظیم کارپوریشنز جو دنیا کی منڈیوں پر چھائی ہوئی ہیں وہ یہاں جلوہ گر تھیں۔

لیکن مجھے تو سب سے زیادہ لطف ''بلی گرام'' مبلغ کے اشتہاروں میں آیا۔ یہ ''ایونجلک'' پیامبر بھی اپنی دکان لگائے۔ ''نروان''

KitaabPoint.blogspot.com

کی پرچون کر رہا تھا۔ ایک دن یہ "مکئی" سوپر مارکیٹ میں دس فیصد کٹوتی پر بک رہی ہوگی۔

ایک شام میں بچوں کو "یواین" دکھانے لے گئی۔ دکھاتے دکھاتے خود ہانپ گئی۔ ہر شاندار ہال ایک خوشحال ملک کا تحفہ تھا۔ جتنی "یواین" کی سجاوٹ موثر ہے۔ اگر اس کی سیاست بھی ایسی ہوجاتی تو کئی ملکی قسمتیں سنور جاتیں۔ اس عالمی ادارے پر ایک مصرعے کا مرثیہ کہا جاسکتا ہے۔

نشستند و گفتند و برخاستند

اس کی مشاورتی مجالس کریں بھی کیا؟ جب تک "کونگو" پر ڈرافٹ تیار ہوتا ہے' پیچھے کونگو کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ ہر جرنیل ایک نئے رنگ کا مربی ڈھونڈھ لیتا ہے۔ کوئی سرخ' کوئی پیلا' کوئی سفید' کوئی کالا۔

ابھی عرصہ دراز تک افریقہ' ایشیا اور لاطینی امریکہ۔ پانچ بڑی طاقتوں کی شطرنج میں محض پیادوں کی طرح استعمال ہوں گے۔

یہ یواین او تو بالکل ڈھکوسلا بن کر رہ گیا ہے۔ اسے امریکی خارجی پالیسی کا دایاں بازو کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ عمل کے وقت اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ انصاف کے وقت آواز بیٹھ جاتی ہے۔ مجھے تو اس کی زیست کا صرف ایک جواز ملتا ہے اور وہ یہ کہ کمزور قوموں کی ناک رکھنے کے لیے یہ اچھا بہانہ بن سکتا ہے۔ جب غریب پٹنے لگے تو یہی کہتا ہے کہ کوتوال روک رہا ہے' ورنہ میں ابھی اور مارتا۔

اس کے غیر سیاسی ادارے بھی کوئی خاص سودمند یا نتیجہ خیز نہ بن سکے۔ وجہ وہی پرانی! "پارکن سن قانون" کے بموجب اس کے دفاتر و عملے وسیع ہوتے گئے۔ غیر ملکی امداد محدود ہوتی گئی۔ بین الاقوامی خیرات کے دس آنے اس ادارے کے متعدد بازوؤں کی شان وشوکت پر خرچ ہوتے ہیں اور چھ آنے بھکاری ملکوں تک پہنچتے ہیں۔

بہرحال اس ادارے کے دبیز قالینوں پر چل کر اس کے مہنگے ریستوران میں ہزار قسم کھا کر انسان کو ایشیا کے قحط فراموش کر دینے چاہئیں۔ اس مہذب سفیری فضا میں ہر ایک دوسرے کو Your Excellency کہتا پھرتا ہے۔ ہم بھی کچھ دیر کو اپنے آپ کو "مائی ایکسی لینسی" سمجھنے لگے اور اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیا کہ اس وقت ہم عالمی امن کی آخری نیم کشتہ امیدوار بین الاقوامی انصاف کے موروثی مدفن میں بیٹھے ہیں۔

امریکہ کے ایک رئیس ترین خاندان کے ایک فرد مسز وِنڈربلٹ ویب نے دو سال ہوئے دستکاروں کی ایک عالمی کونسل بنائی۔ جس میں پچپن ممالک نے نمائندگی حاصل کی اور ان کو اپنا صدر چنا۔ یہ خاتون جب پاکستان میں دستکاریاں دیکھنے آئیں تو مجھ سے

KitaabPoint.blogspot.com

ملیس اور میں نے پاکستان ٹائمز کے لیے ان کا انٹرویو بھی لیا۔ یہ ستر سالہ لمبی صحت مند بیوہ ہیں جو عیسائی مشنری زیادہ معلوم ہوتی ہیں اور امریکی امیرزادی کم۔ انہوں نے مجھے نیویارک میں لنچ پر بلایا اور ''ہاؤس آف امریکہ'' دکھایا۔ ان کی سرپرستی میں یہ ایک کامیاب ادارہ ہے۔ یہاں ہنرمند دستکار کو ہر قسم کی مدد اور نئے نئے مارکیٹ بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ اس کی دو منزلوں پر ہر دستی ہنر میں تجریدی جدت پیدا کی گئی ہے۔ لیکن جدت نے ضرورت اور افادیت کو طلاق نہیں دی۔

تین دفعہ امریکہ میں داخل ہوئے اور نکلے۔ اس درآمد برآمد میں امریکہ کا ہر دفعہ ایک نیا رخ دیکھا۔ امریکہ کے بھی شومہاراج کی طرح کئی رخ ہیں۔ کئی روح پرور اور روح فرسا رخ۔ ایک مخلص مبلغ کا جو دنیا کو اخلاقی اصولوں کی تلقین کرتا ہے۔ ایک پی جمالو کا جو ممالک کو خود اسلحہ بارود بیچ کر بین الاقوامی مجلس میں تماشا دیکھے۔ ایک دیالوان داتا کا جو سارے جگ کو دان دیتا ہے' ایک یہودی بنئے کا جو دنیا کی ساٹھ فیصد منڈیوں پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ جتنا دنیا کو ''اعانت'' کے نام پر دیتا ہے اس سے زیادہ تجارت کے ذریعے واپس لے لیتا ہے۔ دینے والا بھی خوش' لینے والا بھی خوش!

یہ امریکہ کسی زمانے میں ایشیا اور یورپ کی لبرل تحریک کے لیے ایک مشعل راہ ہوتا تھا۔ اس کی جمہوریت اس کے لبرل آئین اور اس کی امن پسندی صدر ''روزویلٹ'' تک مختلف انٹلکچوئل طبقات کے لیے نظر تھی۔ سنگ مرمر میں صدر لنکن کے کندہ اقوال آج بھی جسم میں حرارت پیدا کر دیتے ہیں۔ پھر اس ملک کی اندرونی اور بیرونی سیاست و اقتدار میں بتدریج کمزوری کیوں اور کیسے آئی؟ یہ جمہوریت کا علمبردار آج لاطینی امریکہ' افریقہ اور ایشیا میں کیوں ست پڑ گیا۔ اور نہ صرف ست پڑا بلکہ کئی ہر دلعزیز جمہوری حکومتوں کو الٹا دیکھ کر شاداں اور فرحاں ہوا۔

جس امریکہ سے ہم حق تلفی منسوب نہیں کرتے تھے آج وہ انصاف کی دوڑ میں پیچھے پیچھے ہے۔ جس ملک نے جنگ عظیم کے بعد مارشل پلان کے ذریعے یورپ کو نئی اقتصادی زندگی بخشی۔ آج اسی ملک نے کرۂ ارض کے گرد تین ہزار کلومیٹر اڈے جما کر اقوام کی آزادی اور تحفظ کو مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا ملک جس کی نوے فیصد دولت صرف دس فیصد ہاتھوں میں ہے۔ یہ ملک اپنی جنوبی اور وسطی غربت کو نہیں سنبھال سکتا۔ لیکن ویت نام کے قتل و غارت پر کروڑوں ڈالر ضائع کر سکتا ہے۔ یہ انسان کو چاند پر پہنچانے کے لیے راتوں رات کئی ارب کا بجٹ منظور کر لیتا ہے۔ لیکن اپنی سرزمین کے چوہوں کو مارنے کی توفیق نہیں جو نیگرو بچوں کا نرم نرم گوشت کتر لیتے ہیں۔ یہ علوم و فنون کا فیاض مربی عالمی ریسرچ کا اکھاڑہ جہاں کے محض ایک عجائب خانے کا بجٹ کراچی میونسپل کارپوریشن کے بجٹ سے تگنا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

جہاں فن معماری پر اتنا خرچ کیا جاتا ہے' جتنا ایشیا کی بھوک پر۔ جہاں ہنر کی اتنی قدر بلکہ پرستش ہو کہ دنیا جہاں کا ہنر سمٹ کر وہاں آن بسے۔ ٹیکنالوجی اور سائنس میں اسی قوم نے وہ زقند لگائی ہے کہ آسمان پر تھگلی جما دی۔ کئی مضامین میں اس کے تعلیمی معیار دنیا میں سب سے اعلیٰ مشرقی ساحل کی یونیورسٹیاں لبرل افکار کی مرجع و ماویٰ ان علمی فضاؤں میں مکمل آزادی فکر' آزادی اظہار۔ مخصوص علاقوں کی صحافت بالکل نڈر اور بے لگام۔ اس کے عوام کو کھلی چھٹی۔ جو چاہیں بولیں' جو چاہیں کریں۔ (البتہ نیگرو کے لیے قوانین جدا ہیں)

اس کے باوجود سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا وجہ ہے کہ امریکہ کر ہر لبرل صدر یا صدارت کا لبرل امیدوار قتل ہو جاتا ہے۔ وہ کیا پوشیدہ طاقت ہے جو ایک خاص مقام پر پہنچ کر ''لبرل ازم'' کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔

صدر آئزن ہاور کی آخری الوداعیہ تقریر کانگریس کے سامنے یادگار رہے گی جس میں انہوں نے امریکی معاشرے کو ''ملٹری انڈسٹریل کومپلیکس'' کے خلاف متنبہ کیا تھا۔ یہاں اونچے پائے کی تجارت فوج پر چھائی ہوئی ہے۔ ہر قسم کا دباؤ ڈال کر سودے بازی کرتی ہے اور پھر یہ فوج یعنی ''پینٹاگن'' امریکی صدر پر چھا جاتی ہے۔ اس ملک کی جمہوریت پر پوشیدہ دروازوں سے طرح طرح کے دباؤ ڈالے جاتے ہیں۔ ان ''پریشر گروپس'' کی ایک چھوٹی سی مثال اس طرح ملتی ہے کہ پینتیس سال تک امریکہ ایک معصوم اصلاحی آئین اپنے معمر مفلس مریضوں کے لیے پاس نہ کر سکا کیونکہ امریکی میڈیکل ایسوسی ایشن ہر دفعہ کانگریس کے ممبران اور پریس کو لاکھوں ڈالر کی رشوت دے دیتی تھی۔

امریکن سوسائٹی کسی بھی فلاحی اصلاحی پر ٹھٹھک جاتی ہے۔ فلاح و بہبود انفرادی طور پر بہت ہوتا ہے۔ جتنی خیرات یہاں بٹتی ہے شاید کم ہی اور جگہ بٹتی ہو۔ مگر سرکاری فلاح و بہبود کے ذکر پر بھی قوم کے ایک خاص طبقے کے کان فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس فری انٹرپرائز معاشرے میں انفرادی سعی پر اس حد تک زور دیا گیا ہے کہ حکومت اگر کوئی قدم اٹھائے تو اس پر ''سرخ اشتراکیت'' کا الزام نہیں تو ''گلابی سوشل ازم'' کی تہمت ضرور لگ جاتی ہے۔

تو صاحب اس ملک کی تجلیاں اور تاریکیاں کہاں تک بیان کروں۔ اور ملکوں میں بھی ہزاروں تضاد ہیں۔ ہمارے اپنے معاشرے کے ظاہر اور باطن میں کتنا فرق ہے۔ ہمارے یہاں سیاست رسوا' سرکاری نظام رسوا۔ مذہب کے نام پر کیا کیا ابلیسی سازشیں ہوئی ہیں۔ نہ انفرادی اخلاق نہ سماجی اخلاق۔ نہ اقتصادی یا بیوپاری ایمانداری۔ ہم کسی کو کیا کہہ سکتے ہیں۔ اپنے گریبان میں پہلے منہ ڈالیں' ہماری تو جڑیں کھائی گئیں۔ اب نیا عہد نئے بیج بوئے گا تو شاید اچھی فصل اگے۔ اور ہماری طرح اکثر مشرق کے

KitaabPoint.blogspot.com

غریب ممالک کا برا حال ہے۔ ان مشرقی ممالک کی بدعملیوں کو معاف تو نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان ممالک کے اقتصادی اور سماجی حالات جرائم کی سنگینی کو کم ضرور کر دیتے ہیں لیکن دنیا کے سب سے امیر ملک کو کیسے معاف کریں جس میں ہر طبقے پر مخمل میں ڈھکی چھپی اور نفاست میں پروئی ہوئی رشوت چلتی ہو۔ ''بلیک میل'' تو ایک طرف ہم غریبوں کے ملک میں جرائم عموماً زر' زمین' زن' کے چکر میں ہوتے ہیں۔ امریکی معاشرے میں کئی دفعہ دیکھا کہ ''جرم برائے جرم'' بلکہ ''جرم برائے لذت'' ہوتا ہے۔ ان جرائم کی نوعیت اور فہرست روز اخباروں اور رسالوں کے کالم کی سرخیاں بنتی ہیں۔ پریس' ٹیلیویژن اور ہالی وڈ کی فلموں نے جوانوں کو اتنا سنسنی خیز اور سنسنی پسند بنا دیا ہے کہ جو کچھ وہ پردہ سیمیں پر دیکھتے ہیں۔ اس کو اپنی روزمرہ زندگی میں بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

ماہرین نفسیات' والدین اور پادری سب پریشان ہیں کہ نوجوان نسل کے اخلاقی و روحانی بحران کو کیسے روکیں۔ اس کی وجہ کہاں تلاش کریں۔ خاندانی میراث میں؟ مادری تربیت میں؟ سکول کالج میں؟ کلب میں؟ سماجی ماحول میں؟ یا بارود کے اس کھلے بیوپار میں جس پر حکومت نے کوئی پابندی نہیں لگاتی۔ (دنیا میں سب سے زیادہ ہتھیار اور بارود امریکہ کے اندر استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ تحفتاً ڈاک خانے کے پارسلوں میں بھیجا جاتا ہے۔ کرسمس یا بڑے دن پر آپ اپنی محبوبہ کو پھولوں کے ساتھ ایک ننھی سی پستول بھی بھیج سکتے ہیں)

بھلا ہو امریکہ کی معدنی اور زرعی زرخیزی کا۔ ایک ہی نسل میں انہوں نے اتنا مال جمع کر لیا کہ آئندہ نسلیں اس کو دوگنا تگنا کرتی گئیں۔ مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ۔ لیکن جتنی مایا بڑھتی گئی۔ اخلاق کا یا پلٹتی گئی۔ اب یہ خوش نصیب ملک جس کو خدا نے ہر نعمت سے فیض یاب کیا کئی سماجی روگوں میں گرفتار ہے۔ اٹلی میں بھی مافیا ہے لیکن یہاں جرم کو سیاسی جتھا اور ٹریڈ یونین نہیں بنایا گیا۔ لوگ پہلے صرف جنوب یا شکاگو کو روتے اور بدنام کرتے تھے۔ اب منظم غنڈہ گردی امریکہ کے ہر بڑے شہر میں ہو رہی ہے۔ اب واشنگٹن جیسے شریف شہر میں جھٹپٹے کے بعد بعض علاقوں میں نکلنا مشکل ہے۔

امریکہ نے ڈاکٹر فاوسٹ جیسا سودا کیا ہے۔ جلوۂ حسن کے بدلے اپنی روح کو فروخت کر دیا۔ مذہب کو لپیٹ کر چھتری کی طرح کونے میں رکھ دیا گیا ہے۔ جسے صرف اتوار کو کھولا جاتا ہے۔ اس کی جگہ عام طور پر ایک نیا مذہب آ گیا ہے۔ ''لچھمی دیوی کی پوجا'' پیسہ بناؤ جلدی جلدی کسی طرح۔ کسی ذریعہ سے بھی ہو بناؤ (یہی اقدار اب مشرق میں بھی سرایت کر رہی ہیں)

انفرادی ضمیر کی جگہ اجتماعی اخلاقیات آ گئی ہیں جرائم اس لیے نہیں ہوتے کہ ہمسائے کے ساتھ رہنا مشکل ہو جائے گا۔ پھر نیم پختہ علم نفسیات نے اور بھی ستیاناس کر دیا۔ یہ جرم کی وجہ لاشعوری ذہن کے پس منظر میں ڈھونڈ کر مجرم کی بجائے جیل خانے کے پاگل

KitaabPoint.blogspot.com

خانے بھیج دیتے ہیں۔ پھر یہ خیال بھی ہر دلعزیز ہوتا جا رہا ہے کہ وہ جرم جرم ہی نہیں جس سے کسی کو نقصان نہ پہنچے۔
خدا آئن سٹائن کو بخشے جس کے اضافیت کے نظریے نے اخلاقیات کو بھی اسی طرح متاثر کیا ہے کہ زندگی کی ہر قدر اضافی ہو گئی ہے۔ اور مستقل انسانی قدریں عنقا ہوتی جا رہی ہیں۔
یہ نوع انسان کی تاریخ میں پہلی قوم ہے جس کا بنیادی مسئلہ دولت کی کمی نہیں بلکہ افراط ہے۔ "میڈیسن ایونیو" میں اقتصادیات کے ماہرین کی ایک فوج بیٹھی صرف دن رات یہ سوچ رہی ہے کہ معاشرے میں نئی سے نئی مانگ کیسے پیدا کریں۔ اکسا اکسا کر بہکا بہکا کر ورغلا ورغلا کر عوام کو کس طرح چیزیں خریدنے پر رام کیا جائے کہ ٹوتھ پیسٹ کی ایک سو چار اقسام کے باوجود ایک سو پانچویں قسم بہترین ہے۔ زیادہ خرچ زیادہ مانگ اور زیادہ پیداوار کا ایک چکر چل رہا ہے۔
خدا کا یہ کہنا کہ "ہم تمہیں مال و دولت سے آزماتے ہیں" یہاں پورا ہوا ہے۔ اتنا ملا کہ یہ قوم دینے والے کو بھول گئی۔ اب صرف اس کا امیر طبقہ ہی فرصت کا مالک نہیں بلکہ متوسط طبقہ بھی کم سے کم محنت اور زیادہ سے زیادہ لمحات فرصت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ اب ماہرین کے لیے دوسرا مسئلہ درپیش ہے کہ قوم کو فرصت کا صحیح استعمال کیسے سکھائیں۔ کچھ مفکروں کا خیال ہے کہ امریکی قوم اخلاقی طور پر منتشر ہو رہی ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ ہے بیزاری۔ اور تجارتی تفریح سے ماؤف دماغ جتنی مشینیں مزدوروں کی جگہ لیتی جا رہی ہیں۔ جتنی "خودکاری" ظہور پذیر ہو رہی ہے۔ ایک امریکی کی فارغ الوقتی اور فارغ البالی بہ الفاظ دیگر "بیزاری" بڑھتی جا رہی ہے۔
قوم کی تفریح اور تعلیم کا منبع ٹیلیویژن بن کر رہ گیا ہے اور اس کے معیار محض سوداگرانہ ہونے کی وجہ سے مہلک بن گئے ہیں۔ (امریکہ اپنے بجٹ کا ڈیڑھ فیصد تعلیم پر خرچ کرتا ہے۔ اس کے برعکس غریب انگلستان تین فیصد اور روس ساڑھے فیصد) ٹیلیویژن اس بیکراں قوم سے بیک وقت خطاب کرنے کا ایک ہی ذریعہ رہ گیا ہے۔ اور اس ذریعہ نے قوم کے "دندان ذہن" کو خوش فہمی کا نرم نرم حریرا پلا پلا کر اس کی استعداد کو مفلوج کر دیا ہے۔ "ایڈورڈ مرو" آنجہانی جو ٹیلیویژن کا سب سے اعلیٰ صحافی اور ناشر تھا اور جس نے معاشرے کے مختلف پہلوؤں پر دلیرانہ روشنی ڈالی اور میکارتھی کہ تنگ نظری اور سیاسی بغض کو پردۂ سیمیں پر کروڑوں آنکھوں کے سامنے بے نقاب کیا۔ خود اپنے محبوب ٹیلیویژن کے متعلق کہتا ہے۔ "کسی بھی ملک میں ٹیلیویژن جیسا عوامی خطیب اس کے سماج کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی مزاج کا صحیح عکاس بنتا ہے۔ ہم امریکی آج کل مالدار، موٹے، آرام دہ اور خوش فہم ہو گئے ہیں اور ہم اپنی ہر ادا پر خود فدا ہیں۔ ہم اپنی مادی تکمیل میں اتنے مگن ہیں کہ ہم میں ناخوشگوار معلومات دیکھنے کا رجحان ہی نہیں رہا۔ جب تک ہم یہ نہیں

KitaabPoint.blogspot.com

سمجھیں گے کہ ٹیلیویژن کو عوام کو بہلانے' دھوکہ دینے اور حقیقت سے بچنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہم نیم خفتہ کہلائیں گے اور شاید اسی وقت جاگیں گے جب بہت دیر ہو چکی ہوگی۔"

امریکہ کے "روکی فیلر" اور "فورڈ" دنیا میں ضرب المثل بن گئے ہیں۔ اس ملک کے پیش رو خاندانوں نے نئی نئی دولت تو حاصل کر لی مگر یورپ کی خاندانی قدامت نہ خرید سکے اس کے لیے انہوں نے اپنے گروہی حدود کھینچنا شروع کر دیں جو فرانس انگلستان اور بقیہ یورپ کے اعلیٰ خاندان برقرار رکھتے ہیں۔ معیاری کھانے' معیاری پوشاک' معیاری محل' معیاری مشاغل' معیاری شادیاں (انقلاب بہت ضروری ہیں) معیاری فنون کی سرپرستیاں۔ یہ امریکہ کے ساٹھ خاندان صحافت کی دنیا میں سرخیل بن گئے ہیں۔ آئے دن ان کی تصویریں نکلتی ہیں۔ یہ ہر وقت عوام کی رشک آمیز نظروں میں ہیں۔ اب جوں جوں پیسہ پھیلتا جا رہا ہے۔ ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسا وقت بھی آئے گا کہ ہر محلے میں کروڑ پتی ہوں گے۔ یہ ریل پیل کہاں جا کر رکے گی۔ کیا اس بہتی گنگا میں سب ہاتھ دھو سکتے ہیں؟ لیکن یہ سب صرف بالائی طبقات کے لیے روا ہے۔ باقی سب اس نعمت سے محروم' اس کی وجہ قدیم لاعلاج تعصب ہے۔ دنیا میں نسلی اور سماجی بغض کو کہیں اتنا منظم پلیٹ فارم نہیں نصیب ہوا جیسا امریکہ میں۔ پہلے ہمیں بتایا جاتا تھا کہ یہ زہر صرف جنوب تک محدود ہے۔ جنوبی حصہ نہ صرف حبشیوں پر زیادتیاں کرتا ہے۔ بلکہ کسی "لبرل" صحت مند اور آزاد عنصر کو پنپنے نہیں دیتا۔ یہ جاہلان جنوب جن کی اکثریت فوج میں بھرتی ہے۔ سماجی انصاف و مساوات کے خلاف ہیں۔ جب تک وہ ان کی موافقت میں نہ ہوں نتیجہ صفر۔ چنانچہ جنوب میں "کلوکس کلن" جیسی مہلک تحریک پر اسرار پردوں میں شروع ہوئی اور مشرق امریکہ میں "برچ سوسائٹی" یہ دونوں سفید تحریکیں در پردہ کروڑوں روپے کے چندے پر اس لیے پل رہی ہیں کہ ان کا نوشتہ لائحہ عمل یہ ہے کہ کسی غیر سفید کو سر مت اٹھانے دو۔ بلکہ ان سفید چیزوں کو بھی جو ہمارے معاشرے میں انتشار پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ (اور انتشار سے مراد ہے سماجی مساوات نیگرو کو حقوق۔ جمہوریت امن پسندی کے لیے احتجاج۔ جرائم اور بے انصافی کا انسداد) یہ تحریکیں امریکہ کے بڑے تاجروں کے پیسے سے زندہ ہیں۔ امریکہ کا سرکاری نظام اس کے سامنے بالکل بے بس ہے۔ آزاد صحافت کہیں کہیں ان کے خلاف اپنی آواز بلند کرتی ہے۔ لیکن کون سنتا ہے۔ جنوب کے تو کئی منصف مزاج نامہ نگار اور مدیر اس تحریک کے پوشیدہ ہاتھوں سے قتل ہو گئے۔

امریکہ کے متعلق میرے تاثرات طول پکڑ گئی مگر اپنے برصغیر اور انگلستان کے بعد اگر کسی معاشرے کو قریب سے دیکھا تو اس کو۔ کیونکہ اس ملک سے امیدیں زیادہ تھیں اس لیے مایوسی بھی زیادہ ہوئی ہے۔ میری زندگی کے چند بہترین دوست اور سہیلیاں اس ملک کے ہیں۔ اس کے اکثر عوام نہایت گرم جوشی اور محبت والے ہیں۔ باہر والوں کی دل و جان سے خاطر بھی کرتے ہیں۔ راہ چلتے بھی ہنس

KitaabPoint.blogspot.com

کر بات کرتے ہیں۔ آگے بڑھ کر مدد کرتے ہیں۔ خوش مزاجی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اکثر سیاح اس ملک سے خوشگوار یادیں بھی لاتے ہیں۔ لیکن میری طرح بیشتر سیاح ذاتی شخصیتوں اور ملکی لائحہ عمل کو ہم معنی نہیں سمجھتے۔ امریکی عوام کا بیشتر حصہ نیک دل امن پسند ہے۔ لیکن اس ملک کی اندرونی اور خارجی پالیسی نے ایسا نظام پیدا کر رکھا ہے کہ عوام تک بہت سے حقائق نہیں پہنچتے اور ان کو ووٹ دیتے وقت تصویر کے دونوں رخ نہیں معلوم ہوتے۔ امریکی اخبارات اپنے اندرونی حالات شائع کرنے میں آزادی رکھتے ہیں۔ مگر خارجی پالیسی کے لیے سرمایہ داری کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اور اس سے بدتر حالت ٹیلیویژن کی ہے۔ جہاں عوام کو بین الاقوامی حقیقتوں تک پہنچنے کی اجازت نہیں۔

امریکہ کا سیاسی نظام اور الیکشن کا گورکھ دھندا اس قدر پیچیدہ اور پراسرار ہے کہ باہر کے لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ اس کے علاوہ ایک طبقہ جو نہ ری پبلکن کے ساتھ ہے نہ ڈیموکریٹ کے ساتھ ہے۔ بالکل بے آواز اور بے آسرا ہے۔ اسی الیکشن کے گورکھ دھندے نے رابرٹ کینیڈی کو راستے سے ہٹایا۔ یوجین میکارتھی کو شکست دلوائی۔ اور نکسن جیسے نورعلی نور صدر کو چنا۔ اس سیاسی نظام کو بدلنے کے لیے جب بھی کوشش ہوگی' دبا دی جائے گی۔ کیونکہ وہ دس فیصد امیر طبقہ جو صحافت اور سیاست کی اکثریت پر حاوی ہے خاصا رجعت پسند' تنگ دل اور کوتاہ نظر ہے۔ وہ ذرا سی اصلاح سے ڈر جاتا ہے۔

پچھلی گرمیوں سے اب تک امریکہ کے ضمیر نے کروٹ لی تھی۔ ہمیں اس سے بہت امیدیں تھیں۔ اور اب بھی خواہش رکھتے ہیں کہ خدا اس قوم میں ایسے رہبر پیدا کرے جن کو امریکی معاشرہ نہ صرف جینے دے بلکہ رہنمائی کرنے دے۔ جب کوئی چھوٹا ملک حماقتیں کرتا ہے تو ان کا اثر صرف اپنے تک محدود رہتا ہے۔ لیکن جب امریکہ جو بیشتر دنیا کی قسمتوں پر چھایا ہوا ہے۔ بے لگامی کے آثار ظاہر کرتا ہے تو خوف آتا ہے۔ کیونکہ اس کی کرتوتیں دوسرے ممالک پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔

آخر میں چند باتیں امریکی عورت کے بارے میں لکھنا چاہتی ہوں۔ امریکی عورت کا دنیا میں جواب نہیں۔ نسلی اخلاط کے خمیر سے اٹھی ہوئی یہ عورت بہت حسین ہے۔ صحت مند ہے اور ہرفن مولا ہے اس کے گوناگوں مشاغل نے اسے اتنا دلچسپ اور بذلہ سنج ساتھی بنا دیا ہے کہ مرد اس کی صحبت میں بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ اور دیکھا بھی ہے کہ گھر میں اسی کا راج ہوتا ہے۔ خاوند کی کم چلتی ہے۔ مردوں کو اس عورت کے خلاف شکایات ہیں کہ وہ بہک گئی ہے۔ امریکہ کی روایتی خانگی پاک دامنی پر بد ہے۔ خاندانی امن پر سایہ ہے۔ تیرہ چودہ سال کی عمر ہی سے یہ جنسی آزادی چکھ لیتی ہے' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ سب الزامات نہ صرف یورپی عورتوں پر عائد ہو سکتے ہیں۔ بلکہ ایشیائی ملکوں کی کوئی عورتوں پر بھی۔ البتہ بوڑھی امریکن عورتوں کا طبقہ دنیا سے نرالا ہے۔ یہ طبقہ امریکہ کی کثیر دولت کا

KitaabPoint.blogspot.com

بڑا حصہ دار ہے۔ کیونکہ یہ زیادہ تر بیوہ عورتوں پر مشتمل ہے۔ امریکی مرد جب کما کما کر تھک جاتا ہے تو چل بستا ہے۔ اور یہ نقرئی زلفوں والی ساٹھ ستر سالہ امیر زادیاں دنیا کی سیر کو نکل کھڑی ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک میں بڑی بی کو ڈھائی گز کورا لٹھا اور دو گز زمین سونپی جاتی ہے۔ امریکہ کی معمر خاتون کی نئی زندگی ساٹھ کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ بہر حال مجھے امریکی عورت سے متعصبانہ حد تک محبت ہے کیونکہ یہ عورت سیماب کی طرح بے چین۔ زندگی سے بھرپور، علم اور خلوص سے سرشار۔ اپنے دل میں ساری دنیا بلکہ سارے آفاق سے عشق رکھتی ہے۔

عورت کی زبان جب چلتی ہے' تو رکتی نہیں۔ اس لیے اب میں ذرا خاموش ہو جاؤں تو بہتر ہے۔ امریکہ کا تجزیہ تو بڑے بڑے عالم ضخیم جلدوں میں کریں جب بھی مکمل نہ ہو مجھ غریب کی کیا بساط! یہ ملک خداداد قدرتی حسن اور سماجی امارت کا شعوری طور پر مالک ہے۔ جس میں جتنی خوبیاں ہیں اتنی کمیاں۔ یہ امریکہ کیا ہے؟ ایک نیا ملک۔ ایک نئی قوم بلکہ قومیں جو ایک سیاسی نشان و آئین کے ارد گرد شعوری طور پر جمع کی گئی ہیں۔ یہاں ایک معاشرتی کھچڑی ہے جو پک پک کر ابل رہی ہے۔ اس ملک کا رقبہ اتنا وسیع ہے کہ اگر سین فرانسسکو میں کوئی سانحہ ہو تو نیو یارک میں کوئی خبر نہیں۔ کوئی تعلق و تجسس نہیں کیوں کہ ان دونوں میں اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ لندن اور بغداد میں!

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

ہانگ کانگ

لڑکپن میں اس نام سے چینی طوائف' بر قانی جرائم اور افیم خانے منسوب تھے۔ خدا ہالی وڈ کی فلموں کو سلامت رکھے جو ہر ملک اور ہر شہر کا حلیہ اس طرح بگاڑتے ہیں کہ اسے پہچانتے پہچانتے وقت لگتا ہے۔

بڑے ہوئے تو ہماری سہیلیوں نے ہانگ کانگ کی (بقول بمبئی والوں کے) ''بونگ مارنی'' شروع کی۔ ساڑھیاں' کیمرے' گھڑیاں' ہیرے۔ لیکن ہماری مثال تو وہ تھی کہ ہاتھی بکا دو ستا اور بکری مہنگی۔ پیسہ ہو تو سب چیزیں بھلی معلوم ہوتی ہیں نہ ہو تو ادنیٰ چیز بھی باوا کے مول نظر آتی ہے۔ میاں کی شروع شروع کی نوکری تھی دو اور دو چار جوڑتے ہوئے بھی بجٹ مشکل سے پورا ہوتا تھا۔ اس لیے ہانگ کانگ میں کوئی دلچسپی پیدا نہ ہوئی۔ پھر کچھ سال ہوئے ''حسین سوین'' کا دل پذیر ناول جسے دنیا جتنا بھی سر پر اٹھائے کم ہے پڑھا۔

Love is a many Splendoured thing

چین اور یورپ کے مخلوط خمیر سے اٹھی ہوئی اس خاتون نے ہانگ کانگ کا ایسا نقشہ کھینچا کہ میں تڑپ اٹھی۔ غالباً اس مصنفہ کا پہلا اور آخری عشق ہانگ کانگ میں واقع ہوا تھا۔ اس لیے انہوں نے وجد میں آ کر وہ رنگ اس جزیرے میں بھرے کہ قوس قزح بھی شرما گئی۔ آخر میں عورت ہوں نازک اور حساس۔ تہیہ کر لیا کہ یہ جزیرہ مرنے سے پہلے ضرور دیکھوں گی۔ اس قسم کے ارادے میں نے متعدد مرتبہ کیے۔ چونکہ موت وقتاً فوقتاً ملتوی ہوتی رہی تھی۔ اس لیے اللہ کی بنائی' خاصی دنیا دیکھ لی۔ میرے میاں کہتے ہیں کہ ''تمہارا مرنا ابھی بہت دور نظر آتا ہے۔ اس لیے مرتے مرتے تم میری جیب خالی کر جاؤ گی۔''

میرے شوہر محترم ایک کانفرنس میں ٹوکیو جا رہے تھے۔ ہوائی جہاز میں دو گھنٹے باقی تھے۔ میرے دل میں جو سمائی تو پوچھا۔

''چلوں؟'' فرمایا ''چلو''

اس قدر مختصر اجازت' اس سرعت سے کسی بیوی کو ایک ''سی ایس پی'' سے کبھی نہیں ملی ہو گی۔ بہرحال دیوانگی سے زیادہ اپنے میاں کی ہمت اور فیاضی کی داد دیتی ہوں۔

تو لیجیے صاحب! ادھر میں نے سوٹ کیس میں چار ساڑھیاں پھینکیں۔ ادھر میاں نے ٹکٹ کے لیے اسٹیٹ بنک سے اجازت

KitaabPoint.blogspot.com

لی۔ ہانگ کانگ کے لیے ویزا درکار نہیں ہوتا۔ روپیہ مجھے نہیں چاہیے تھا۔ اس لیے اسٹیٹ بنک کو پس وپیش کی کچھ گنجائش ہی نہ رہی۔

میرے میاں پر چودہ سال میں میری صرف ایک بات کا رعب پڑا ہے۔ اور وہ ہے میری قناعت۔ میں ممالک غیر میں خرید و فروخت کا درندہ کبھی نہیں بنتی۔ دوسرے ممالک میں سیر و سیاحت کے مواقع اس قدر ہوتے ہیں کہ خریداری کے لیے وقت کم ہی بچتا ہے اور یہ اپنے اپنے شوق کی بھی بات ہے۔ شاید اس مسئلے میں مجھ میں نسوانیت بہت کم ہے۔

قصہ کوتاہ' دو گھنٹے کے اندر میں میاں کے ساتھ ''پی او اے سی'' کی آرام دہ کرسی پر دراز تھی اور نیچے زمین پر رہنے والے تاپتے ہی رہ گئے کہ یہ گئی کہاں؟

میرے والد کا فون آیا کہ رسولن بائی کی محفل موسیقی جمنے والی ہے۔ اختر کا انتظار ہو رہا ہے' کہاں ہے؟'' نوکر بولا ''بیگم صاحب جاپان چلی گئیں۔''

جواب ملا ''کیا بکتے ہو' ابھی تو وہ مجھ سے طنبورہ لانے کو کہہ رہی تھی۔''

بہرحال جو صلواتیں مجھ پر پڑی ہوں گی وہ میں ہی جانتی ہوں لیکن اس وقت تو ہانگ کانگ کے لیے میری روح پر تول رہی تھی اور مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔

تیسرے پہر ہمارا جہاز دو چار بادلوں کے جھرمٹ میں اترنا شروع ہوا۔ جزیرے کے جاذب خط و خال ابھرے۔ کہیں کہیں دھوپ کے دھبے' کہیں کہیں چھاؤں کی چھائیاں' پرسکون پانی' نیا ہوائی اڈہ' عین دو پانیوں کے بیچ میں بنایا گیا ہے۔ جہاز اس طرح پانی کو چھوتا ہوا اترتا ہے کہ گویا آبدوز کشتی ہے۔ کم از کم اس کے پر تو ضرور چھینٹے اڑاتے ہوں گے۔ ہوائی اڈہ کشادہ' کسٹم افسران ''سمگلروں'' کے باوجود باتمیز اور پھرتیلے' ٹیکسی تیز اور سستی' مغربی ہوٹل مہنگے' چینی سرائے سستے' بازار رات کے بارہ بجے تک کھلے ہوئے' سڑکوں پر ساری رات رونق' ایک جاندار اور جوشیلا شہر ہے ہانگ کانگ! آپ اس سے کبھی بیزار نہیں ہو سکتے۔

پچھلے برسوں میں اتفاق سے مجھے اسے تین دفعہ دیکھنے کا موقع ملا اور تینوں مرتبہ مجھے ازسرنو لطف حاصل ہوا۔ حالانکہ نہ تو یہ کسی بڑے ملک کا دارالسلطنت ہے نہ اس کا کوئی تاریخی پس منظر ہے۔ یہ شہر روایات سے مبرا قدامت سے محروم ہے۔ اس گنجان بستی میں ایک بھی عجائب گھر نہیں اور ہو بھی کیسے؟ اس جزیرے کو سمندری لٹیروں کی بستی کہتے تھے۔ پھر برطانیہ نے کوڑیوں کے مول اسے چین سے خرید لیا۔ جنگ عظیم میں جاپانیوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن پھر پیلی چمڑی کو یہاں سے مراجعت کرنی پڑی اور برطانوی پرچم دوبارہ بلند ہو گیا۔ تو یہ ہے ہانگ کانگ کی تاریخ۔ اس تاریخی یتیمی کے باوجود ہانگ کانگ موجودہ بین الاقوامی سیاست اور سرخ چین

KitaabPoint.blogspot.com

کی روز افزوں طاقت کی وجہ سے دنیا کے نقشے پر یہ ایک نقطہ بن گیا ہے۔ تین دفعہ قیام کے بعد میری ذاتی رائے یہ قائم ہوئی کہ ہانگ کانگ میں پانچ قسم کے باشندے پائے جاتے ہیں۔

ا۔ سیاح....... یہ قوم سردی' گرمی میں سرگرداں رہتی ہے اور باقی آبادی پر اتنی چھائی ہوئی ہے کہ اصل باشندے بعض اوقات نظر نہیں آتے۔ گردن میں کیمرے (تین قسم کے) کلائی پر گھڑی (کم سے کم دو) ناک تک ہاتھ میں بنڈل (کم از کم دس)۔ اس قوم کو اگر ہوائی جہاز بدلنے میں دو گھنٹے کا بھی وقفہ ملتا ہے تو فوراً بازار کا رخ کرتی ہے۔ اس میں ستر فیصد عورتیں ہوں گی جو چمگادڑوں کی طرح دکانوں پر منڈلاتی رہتی ہیں۔ سیاحوں کی اس قوم نے ہانگ کانگ کے دام کہاں سے کہاں پہنچا دیے ہیں۔ یہ جزیرہ کبھی سستا ہوگا لیکن اب نہیں۔ نام بڑے اور درشن تھوڑے۔ میکانکی اشیاء جرمنی میں سستی' ریشمی کپڑے اور نائلون اور مصنوعی زیورات امریکہ میں زیادہ سستے اور اونی ملبوسات انگلستان میں۔

خریداری کے معاملے میں ہانگ کانگ ایک ڈھونگ ہو گیا ہے اور معصوم سیاح اس خوش فہمی میں ہزاروں روپے لٹاتے جاتے ہیں کہ شاید کسی دوسری جگہ یہ چیزیں اتنے داموں میں نہ ملیں۔ اس کی صرف ایک چیز اب بھی سستی ہے اور ہمیشہ سستی رہے گی' اور وہ ہے کشیدہ کاری' ہر سوتی اور ریشمی کپڑے پر۔ بھلا ہو برائے نام مزدوریوں کا جن پر غریب چینی عورتیں دیدہ ریزیاں کر کے زندہ ہیں۔

۲۔ دوسری قسم ماہ عسل (ہنی مون) منانے والوں کی ہے۔ شادی چاہے برازیل میں ہو یا برلن میں' دولہا دلہن ہنی مون کے لیے ہانگ کانگ ضرور جاتے ہیں۔ یہ دنیا سے بے خبر ایک دوسرے کے بازوؤں میں لپٹے ہوئے وقت کی دھار میں بہتے جاتے ہیں۔ اگر صرف ایک دوسرے کی شکل ہی سارے وقت دیکھنی تھی تو یہ جوڑے اتنی دور کیوں آتے ہیں؟ چونکہ مرد یک رومانوی جانور ہے' اس لیے اپنی منکوحہ حماقت کے لیے رومان انگیز پس منظر تلاش کرتا ہے۔

یہ قوم دور سے پہچانی جاتی ہے۔ کیونکہ دولہا کی چال میں نشہ ہوتا ہے اور دلہن کی آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ قوم بھاؤ بھی نہیں چکاتی۔ جو کوئی جہاں کہیں جو کچھ مانگے دے دیتی ہے۔

۳۔ تیسری نوع بیرونی اخبارات کے نامہ نگاروں کی ہے۔ خاص طور پر امریکی صحافی اور سیاسی "آبزرور"....... یہ آبادی سب سے اہم اور خطرناک ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کی گنتی اتنی ہی لامحدود ہے جتنی کہ ان کی کوتاہ علمی' یہ نامہ نگار ہزاروں کی تنخواہوں پر بیٹھے ایک حسین جزیرے میں پل رہے ہیں اور اپنی ننھی دوربینوں سے چین کی دیوزاد وسعتوں کا جھوٹا سچا جائزہ لے لے کر اپنے ہیڈ کوارٹر میں رپورٹیں بھیجتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت نے کبھی چین کی سرزمین پر قدم نہیں رکھا ہے۔ کچھ ادھر سے ٹٹولا اور ایک تبصرہ

KitaabPoint.blogspot.com

گھسیٹ دیا۔ یہی قوم جاسوسی کی خدمات بھی انجام دیتی ہے اور شام کو کلبوں میں ایک دوسرے کے جام صحت بھی پیتی ہے۔ پندرہ سال سے مشرق و مغرب کے دانشور اسی گروہ کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان کے متعلق لطیفے گھڑ رہے ہیں۔ جملہ بازیاں کر رہے ہیں لیکن ان کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ امریکہ نے اگر ان صحافیوں کی فوج یہاں نہ رکھی ہوتی اور ہزاروں دفتر ریسرچ کے نہ کھولے ہوتے تو شاید مشرق بعید اور خصوصاً چین پر زیادہ صائب نظر پیدا کر سکتا۔

۴۔ چوتھی قسم اصل نسل باشندے ہیں جن کی معاشرت کی سات پیڑیاں جنوبی چین سے ملتی ہیں۔ ان کے خط و خال، رنگت، لباس، خورد و نوش، لہجہ و زبان خالص کینٹونی (Cantonese) ہے۔ شمالی چین کی نفاست اور شیرینی مفقود ہے۔ اگر اس قوم کو گھنٹہ بھر صرف "کینٹنیز" بولتے ہوئے سنیں تو منہ بسورنے لگیں اور پندرہ منٹ اور سنیں تو بلک بلک کر رو دیں۔ اس زبان کا اتار چڑھاؤ دنیا سے نرالا اور ایسا رقت آمیز ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ ہر جملے پر آواز ڈھئی جاتی ہے اور میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔

بہرحال یہ چینی قوم اصل سرخ چین کا بناپتی نمونہ ہے اور سوائے محنت و مشقت کے جو ہر چین کے خون میں رچی ہوئی ہے۔ اس قوم میں ہر وہ خامی نظر آتی ہے جسے سرخ چینی "بورژوا" تصور کرتے ہیں۔ ہمہ اوقات ذاتی کاروبار، ذاتی مفاد، ذاتی مکاریاں، ذاتیات کی بدترین مثال!

۵۔ اس شہر کی آبادی کی پانچویں قسم طوائفیں ہیں۔ جن کو انگریزی میں بھینے بھینے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ مثلاً "دیمی مونڈ" سڑک کی دوسری طرف کی عورت، سرخ علاقے والی عورت وغیرہ وغیرہ۔

اس موضوع پر مجھے اتنا ہی معلوم ہے جتنا مجھے تینوں بار وہاں بتایا گیا۔ پہلی دفعہ جب میں ہفتہ بھر ٹھہری تو ہانگ کانگ میں ہمارے دوست جو ایک ملک کے سفیر تھے، بہت دلچسپ رہبر بنے۔ وہ طوائفوں پر خاصی ریسرچ کر چکے تھے۔ واللہ اعلم یہ ریسرچ ذاتی تھی یا اکتسابی!

بہرحال اندازہ یہی ہوا کہ ہر ملک کی طوائف قانون سے بچنے کے لیے نئے سوانگ بھرتی ہے۔ جاپان میں گیشا بنتی ہے، لندن میں ٹیکسی سوار، نیویارک میں کال گرل، سویڈن میں ساؤنا کی حمام دان، پاکستان و ہندوستان میں ایکٹرس۔ یورپ میں شبینہ کلب میں رقص اور مشروب کی ساتھی۔ ہانگ کانگ میں طوائفوں نے مالش کرنی سیکھ لی ہے۔ ہر نو آمدہ مرد کو آتے ہی ان مالشوں کی فہرست دی جاتی ہے۔

"رچرڈ میسن" نے "The World of Suzie Wong" لکھ کر اس طوائف کو اور اس قدیم پیشے کو اور ڈرامائی بنا دیا

KitaabPoint.blogspot.com

ہے۔ یہ افسانوی ''سوزی وونگ'' اب ایک اصلیت بن گئی ہے۔ سنا ہے ہانگ کانگ کے ''لک کوک'' ہوٹل پر بن برستا ہے۔ لوگ اس عقیدت سے دیکھنے آتے ہیں۔ گویا ''سوزی'' ابھی باہر آ جائے گی اور ان سے ہاتھ ملا کر سراب پینے بیٹھ جائے گی۔

بعض شہر تو ایک معمر طوائف کی طرح رات کی چکا چوند میں نبھ جاتے ہیں۔ لیکن صبح اگر ان کی مسی سرمہ اتارنے کے بعد شکل دیکھو تو کراہت آئے گی۔ ہانگ کانگ ان نادر جزائر میں سے ہے۔ جو دن کے وقت بھی خوشنما معلوم ہوتے ہیں اور رات کو ان کا حسن اور بھی نکھر آتا ہے۔ پاکستان کی طرح اس شہر کے دو اہم ٹکڑے ہیں جو ایک دوسرے سے خاصی دور ہیں۔ ایک کو ہانگ کانگ کہتے ہیں دوسرے کو ''کاؤلون'' لیکن چونکہ دونوں کے درمیان پانی ہے اس لیے ہر دس منٹ کے بعد ایک کشتی چلتی ہے جس کا کرایہ واجبی سا ہے۔ اس فیری اسٹیشن پر ہر دس منٹ میں انسانوں کا سیلاب امڈتا ہے اور اس کی دو منزلوں میں سما جاتا ہے۔ پندرہ منٹ میں یہ کشادہ ''فیری'' ایک بستی سے دوسری بستی میں پہنچا دیتی ہے۔ دونوں بستیوں میں خاصا فرق ہے۔ ہانگ کانگ کا سماجی درجہ اونچا ہے۔ وہاں پرانے رئیس نو دولتیا لکھ پتی انگریزی سرکار کے بلند اہلکار اپنی خود پسندی اور خود ستائی میں بری طرح مست ہیں۔

دوسری طرف کاؤلون مقابلتاً سستا ہے۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں میں ننھی ننھی دکانیں بھی ہیں۔ سودا چکانے کا بہت مزا آتا ہے۔ مجھے تو وہ پرانے دن یاد آ گئے۔ جب سائیکل پر ''چن چن چائنا مین'' بوسکی اور کشیدہ کے کپڑے لاد کر بیچتا پھرتا تھا اور بچے پیچھے پیچھے تالیاں بجاتے تھے۔ ان سائیکل سوار سوداگروں سے سودا چکانے کا بڑا لطف آتا تھا۔ وہ زمانہ تھا فرصت کا۔ ماں بہنیں ابھی نوکری کے چکر میں نہیں پڑی تھیں۔ ان کے پاس وقت کی افراط تھی۔ اس لیے ''چائنا مین'' سے کاروبار بھی ایک پکنک ہوتی تھی۔ چاہے دو گھنٹے کی بحث کے بعد ایک رومال یا ایک میز پوش ہی خریدیں لیکن ایک تفریح رہتی تھی اور چائنا مین کو بھی جلدی نہیں ہوتی تھی۔ وہ کم بخت بیس روپے گز سے قیمت شروع کر کے تین روپے گز پر سلک دے کر جاتا تھا اور بیس روپے سے تین روپے پر آنا بھی ایک آرٹ ہوتا تھا۔ بہر حال کاؤلون میں اگر آپ تھوڑی بہت زبان جانتے ہیں تو قیمتیں خاصی کم کروا سکتے ہیں۔ اور زبان نہ بھی جانیں تو ہاتھ کے اشاروں سے سمجھا سکتے ہیں۔ دکانداری میں چینی قوم کو کوئی نہیں ہرا سکتا۔ وہ سو روپے پر صرف دو پیسے نفع رکھتا ہے لیکن بکری کی کثرت پر ہزاروں کما لیتا ہے۔ مسلمان بھائی نہیں کہ پہلے ہی داؤ میں صد فیصد کما لیا اور پھر سارا سال ڈنڈے بجائے۔

کاؤلون میں ایک مشہور سڑک ہے ''ناتھن روڈ''....... جس کا جواب دنیا میں نہیں ہے۔ نیو یارک کا ''ٹائمز سکوائر'' پیرس کا ''شانزا لیزے'' روم کی ''ویا وینیٹو'' اور لندن کی ''پیکاڈلی'' اس سڑک کے سامنے بالکل ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ اس شاہراہ کے جادو کا راز یہ ہے کہ دونوں طرف شانہ بشانہ چینی رسم الخط میں دکانوں کے نام یا اشتہار ہیں۔ جو مخصوص رنگوں سے آراستہ ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں

KitaabPoint.blogspot.com

کالے لال اور سنہری رنگ سے اشتہاری جلووں میں یکسانیت کے ساتھ کرختگی آ گئی ہے۔ ہانگ کانگ کے برقی قمقمے ہلکے گلابی' کاسنی اور فیروزی! ان کی آمیزش پر ایک لاجواب دلنوازی ہے۔ ''نیون'' کی گوناگوں اشتہار بازی گو دنیا میں عام ہے لیکن چینی رسم الخط کی برکت سے ایک ہی اشتہار کسی چینی چتر کار کا طغرہ معلوم ہوتا ہے۔ اتنی روشن اور اتنی سحر آگیں سڑک میں نے اور کہیں نہیں دیکھی۔ اس کو اگر مکمل زاویے میں دیکھنا ہو تو ڈبل ڈیکر بس میں اور اوپر بیٹھ کر دیکھئے۔ یہ سڑک کسی وقت نہیں سوتی۔

ہمارے رہنما اور میزبان ایک پنجابی ڈاکٹر اور ان کی بہن تھی۔ یہ دونوں تحصیل چکوال کے ہیں اور عرصے سے یہاں پر بسے ہوئے ہیں۔ پنجابی چینی تلفظ سے اور چینی چکوالی تلفظ سے ٹھونکتے ہیں۔

پنجابی جوان مرد بھی خوب ہے' اتنا سیلانی' محنتی اور قسمت آزما کہ دنیا کے ہر کونے میں پایا جاتا ہے۔ اسے میں نے ''لیک ڈسٹرکٹ'' میں چوڑیاں بیچتے دیکھا۔ اسے میں نے ''وین کوور'' میں لکڑیاں کا ٹال لگائے دیکھا۔ یہ ہوائی میں ہوٹل چلا رہا ہے اور تبت میں قصابی کر رہا ہے۔

تو خیر ہمیں ہانگ کانگ بہت بھایا۔ ہر وقت گہما گہمی۔ یہ شہر شاید ہی رات کو کبھی پلک جھپکاتا ہو۔ کیونکہ سیاحوں نے اس کولاڈ میں اس قدر بھٹایا ہے (ہمارے چکوالی میزبان کا جملہ) کہ یہ شہر ہر وقت ان کے لیے وا ہے۔ ہر جگہ دوکانداری چل رہی ہے۔ ہوٹل کے کمرے میں' ریلوے اسٹیشن میں' تار گھر میں' ہسپتال میں' غرض جدھر جاؤ اشیاء ہی سجی ہوئی ہیں۔ سامان کی اتنی افراط ہے کہ دکانوں پر سے ابل ابل کر سڑکوں پر گرا پڑتا ہے۔ جدھر نظر جاتی ہے' ہاتھی دانت' کانچ' آبنوس' سیپ' لاکھ' مینا' سیم و زر' ریشم و اطلس کی صنعت کاریاں....... کوئی کیا دیکھے' کیا خریدے!

عورتیں چیلوں کی طرح جھپٹ رہی تھیں۔ اون کے سویٹر' ہزار زیبائشوں یعنی نگ و موتیوں سے آراستہ' نائٹ سوٹ ''کمونو'' کمخوابی اطلس کے نائٹ گاؤن' جوتیاں' بٹوے' چھتریاں' ریڈیوگرام سے لے کر مچھلی کے انڈے تک اور فرنیچر سے لے کر بندر کے دماغ تک کیا نہیں ملتا؟ چین سے اڑائے ہوئے خزانے یہاں' جاپان کی صنعتوں کے گودام یہاں' برطانیہ اور جرمنی کی منڈیاں یہاں...... لیکن اپنے اوسان قائم اور بٹوہ سنبھال کر جیب میں رکھئے ورنہ یہاں دونوں کے غائب ہونے کا خدشہ ہے۔ اس خرید و فروخت کی فردوس میں کئی معصوموں کی حجامت بنی۔ ہم خود دکانداروں کے ہاتھوں الو بن گئے۔ ہمیں ایک ریڈیوگرام دکھایا مگر روانہ دوسرا کر دیا۔

البتہ ہانگ کانگ میں ایک ضخیم شخیم دکان ہے جسے ''سرخ چین کا ایمپوریم'' کہتے ہیں۔ جہاں آپ آنکھ بند کر کے چیزیں خرید

KitaabPoint.blogspot.com

سکتے ہیں اور کوڑی کی بے ایمانی نہیں ہوگی۔ یہ دکان ہانگ کانگ تو کجا سارے ایشیا میں سب سے سستی ہے۔ چین سب پر ثابت کر رہا ہے کہ وہ نہ صرف ہر شے بنا رہا ہے بلکہ سب سے اچھی اور سب سے سستی بھی۔ اس دکان کی ہر منزل پر گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ پس مجھے تو وہ ایک عجائب گھر یا نوادر خانہ معلوم ہوا۔ کاریگری اور دیدہ ریزی کی انتہا تھی۔ میں مزے سے اندر ٹہل رہی تھی اور باہر امریکن عورتوں کی حسرت بھری نگاہوں کو دیکھ رہی تھی' جو اس کی نمائشی کھڑکیوں سے چپکی ہوئی تھیں۔ سیاسی تعصب اور کور بینی کی انتہا ہے کہ امریکہ والوں نے اپنے باشندوں کو اس دکان سے کچھ خریدنا ممنوع قرار دیا ہے۔ اگر اس دکان کا ٹھپہ کسی شے پر نظر آ جائے تو امریکی کسٹم والے وہ چیز ہی ضبط کر لیتے ہیں۔ لیکن عورت ایک عورت پہلے ہوتی ہے اور وطن پرست بعد میں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکن عورت چپکے چپکے چیزیں خریدتی ہے اور اس پر سے سرخ چین کے لیبل پھاڑتی جاتی ہے۔

سیاحت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک انفرادی اور دوسری مجموعی۔ ذاتی سیاحت میں خود دھکے کھاتے پھریئے' ٹیکسیاں لیجئے۔ گائیڈ بک پڑھیے۔ اس میں آزادی زیادہ اور آرام کم ہے۔ مجموعی سیاحت میں اپنے تئیں کسی ٹورسٹ دفتر کے سپرد کر دیجئے۔ وہ آپ کو تین گھنٹے میں آدھا شہر دکھلا دے گا اور پیسے کرارے لے گا۔ اپنی اپنی ذہنیت' مزاج اور بٹوے کی وسعت پر منحصر ہے کہ آپ کون سی سیاحت اختیار کریں۔ پہلی دفعہ تو میں نے دفتری سیاحت کی۔ جزیرے کے چاروں طرف گھومی۔ واقعی اس کے ساحل امن آفریں اور خاموش ہیں۔ مچھلی پکڑنے والے۔ تیراکی کے شیدائی کشتی رانی کے سودائی سب مگن "ٹائگر بام گارڈن" پہنچے۔ یہ ایک چینی لکھ پتی نے اپنے شوق کے لیے بنوایا تھا لیکن جب ٹائگر بام گارڈن سے آمدنی زیادہ ہوگئی تو اس نے باغ کو عوام کے لیے کھول دیا اور نام بھی اسی پر رکھا۔ یہ ایک بھونڈے یا بھیانک دماغ کی ایجاد ہے چاروں طرف اونچی اونچی پہاڑیوں کو کاٹ کاٹ کر تاریخی مناظر اور تاریخی مناظر اور تاریخ لمحے تراشے گئے ہیں کہیں جون آف آرک کو جلایا جا رہا ہے۔ کہیں افریقہ میں بھوت اتارا جا رہا ہے۔ کہیں فرنگی سولہ ہیٹ پہنے چینیوں کو غلاموں کے بازار سے خرید رہا ہے۔ غرضیکہ اوندھے سیدھے مجسمے اور مناظر جنہیں آدھا دیکھ کر ہی سانس پھول جاتا ہے اور دل بھر جاتا ہے۔ اسے Open Air Chamber of Horror کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

نو عمر بہت خوش ہوتے ہیں کہ ہر چڑھائی کے بعد آئس کریم اور نانجار کوک بکتی ہے۔ ہم تو اس بات سے متاثر ہوئے کہ چینی ساہوکار نے کما کر واپس پبلک کو کچھ دے تو دیا۔ ہمارے یہاں تو سوداگر صرف کمانا جانتے ہیں' دینا نہیں۔

قصہ کوتاہ ایک اور جگہ لایا گیا جس کے ارد گرد سیاح طواف کرتے ہیں اور وہ تھا سمندری غذا کا "سی فوڈ" ریستوران۔ مجھے ذاتی طور پر سمندری مخلوقات سے کوئی رغبت نہیں' سوائے مچھلی کے میں نے کبھی کوئی اور آبی پیداوار نہیں کھائی۔ لیکن اس ریستوران میں

KitaabPoint.blogspot.com

لوگوں کو نہ صرف جاندار تھرکتی مچھلیاں کھاتے دیکھا' بلکہ کچھوے اور خوفناک شارک کے پروازی بازو کا مرکب بھی بیچتے دیکھا۔ ہر قسم کے کچھوے' مینڈک' جھینگے' کیکڑے رنگا رنگ کی سلاد میں سجے ہوئے دیکھے۔ انسان بھی کیا جانور ہے۔ ہر چیز کھانے کو تیار ہے۔ جب کچھ اور نہ ملے تو ایک دوسرے کو کھاتا ہے اور بہت مہذب ہو تو اپنے آپ کو کھانے لگتا ہے۔

ہانگ کانگ کے دو رخ ہیں۔ ایک طرف بلند کاخ زریں اور عظیم بارگاہیں اور دوسری طرف غریب مہاجروں کی اداس بستیاں۔ یہ مہاجر کچھ ازلی ہیں اور غالباً چین واپس چلے جائیں گے۔ ایک پورا دن میں ان کی نو آبادیوں میں پھری جو حکومت اور عیسائی تبلیغ مشن قائم کر رہے ہیں۔ گو خدمت سرعت سے ہو رہی ہے لیکن جو مچھیروں کے گاؤں (Aberdeen Floating Villages) کشتیوں میں آباد ہیں' ان کے لیے ناک دور سے بند کرنی پڑتی ہے۔ ایک دو گز پانی کی ناؤ میں ایک انسان کس طرح اپنی زیست کا تقاضا پورا کرتا ہے۔ وہاں دیکھنا چاہیے۔ ہر غلیظ بادبان تلے انسان بمعہ اپنی ''نو آبادیات'' جو وسطاً چار حشرات الارض پر مشتمل ہیں۔ گو دے گور تک کی قید کاٹ رہا ہے۔ بعض علاقوں میں ان مہاجرین کے لیے مشترکہ گھر بنا دیئے گئے ہیں۔ یہاں مشترکہ باورچی خانے' مشترکہ غسل خانے' مشترکہ تفریح گاہیں اور مشترکہ کارخانے ہیں۔ اگر یہ کم نصیب مہاجر سرخ چین کی اشتراکیت سے گھبرا کر یہاں آئے تھے۔ تو کیا یہ نئے آسمان تلے وہی اشتراکیت نہیں؟ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ غریب انسان کہاں بھاگے؟

ہانگ کانگ ایک اور چیز کے لیے مشہور ہے' اور وہ ہے ہیں مشرق بعید کے طعام خانے۔ یہاں آپ برمی' انڈونیشین' جاپانی' کورین ہر قسم کے کھانے کھا سکتے ہیں۔ چینی ریستوران تو خیر ہر وقت بھرے رہتے ہیں۔ مجھے چینی دسترخوان سے خاص انس ہے اور کچھ برا بھلا پکا بھی لیتی ہوں۔ میں نے چینی غذا یورپ میں کھائی۔ امریکہ میں کھائی' جاپان میں کھائی' ہانگ کانگ میں کھائی اور بمبئی' کراچی اور لاہور میں اکثر کھائی۔ اپنے دیس کے چینی کھانے میں مزا تو ہے لیکن خلوص نہیں۔ اصلی چینی کھانے سے اس غریب کا دور کا بھی رشتہ نہیں جڑتا۔ اگر چین جانا نصیب نہ ہو تو کم از کم چینی سفیر کے گھر ضرور اپنے آپ کو مدعو کرایئے جو یہاں چینی چاؤ اور چٹخارہ دیکھا۔ چین سے باہر کہیں نہیں ملا۔ لکھتے لکھتے صرف یاد ہی سے منہ میں پانی آ رہا ہے۔ اٹھارہ کورس کا ڈنر جس کے ''ابتدائیہ'' یعنی Hors D'Oeuvres ہی سے پیٹ بھر جائے۔ مثلاً اسی ابتدائیہ میں سوکھا مرغی اچار کی طرح ڈلی ہوئی چار انچی مچھلی۔ سرکے میں نرم کیا ہوا کھیرا اور بانس کی کونپلیں۔

پھر پردہ اٹھا تو اصلی ڈرامہ شروع ہوا۔ ''چکن چیلی'' نہایت لذیذ ہمارے بریانی کی جگہ ان کی ''مشرومیاں'' جو کھمبوں اور

KitaabPoint.blogspot.com

چاولوں کو سبزی کے قدرتی رنگوں کی تہوں میں دم دی ہوئی۔ پھر ایک ڈش آئی جو طعامی کارڈ پر Frogs Legs بتائی گئی تھی۔ پیٹ میں ننھی سی ابکائی اٹھی لیکن چینی سفیر ہنس دیے۔ ''ارے ڈریئے مت' یہ آپ کے لیے مینڈکوں کا بدرقہ اختراع کیا گیا ہے۔'' پالک کے پتے کو بالکل مینڈک کی شکل کا تراش کر اس میں پسا ہوا مرغی کا قوام بھرا ہوا تھا۔ اس میں صرف جدت ہی نہیں لذت بھی تھی۔

آخر میں سوپ آیا تو میرا سانس الٹا چل رہا تھا۔ کہیں گنجائش نہیں تھی۔ عجیب بات کہ ہم لوگ اتنی چینی کھاتے ہیں لیکن خود ''چینی'' چینی (کھانڈ) نہیں کھاتے۔ نیم شیریں پانی میں کنول کے بیج سامنے رکھ دیئے کہ کھاؤ۔ چینی اپنی قدامت پسندی کو خورد نوش میں بھی لے آئے ہیں۔ پچیس سال پرانا انڈا جو سیاہ ہو چکا تھا' وہ کھلایا۔ سالہا سال پرانی لیچی جن میں اندر پھپھوندی بھنبھنا رہی تھی' بہت شوق سے کھائی۔ اتنی پھپھوندی کھا کھا کر غالباً اس قوم کو پنسلین کی ضرورت نہیں رہی۔

ایک نوع قابل ذکر ہے۔ وہ ہے بدھ کا کھانا۔ اس نوع کے ریستوران ڈھونڈ کر نکالنے پڑتے ہیں۔ لیکن آپ ایک دفعہ براجمان ہو گئے تو پھر بسم اللہ کیجئے اور کھاتے جایئے۔ پلیٹیں کی پلیٹیں خالی ہوتی جائیں گی۔ لیکن آپ کا پیٹ بدستور خالی ہو گا۔ ڈریئے مت' اس کا بل دیتے وقت آپ کے بٹوے کو ہرگز شرمندہ ہونا نہیں پڑے گا۔ بدھ کھانا ہانگ کانگ میں سب سے سستا اور خوش ذائقہ ہے۔ یہ چینی کھانے سے بھی ہلکا رہتا ہے اور بہت زود ہضم ہے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں گوشت کسی قسم کا نہیں پکتا۔ بدھ لوگ عموماً نباتات خور ہیں۔ کوئی ہریاول نہیں چھوڑتے۔ کچے بانس کی جڑیں' کنول کے پھول' کنول کے بیج' اس کے علاوہ ہر طرح کی دال سے دس قسم کے طعام تیار کرتے ہیں۔ دال ہمارے یہاں غریبوں کا سہارا ہے۔ لیکن وہاں پر صرف چنے کی دال سے چھ نمکین ڈشیں اور چھ قسم کی مٹھائیاں تیار کرتے ہیں اور وہ اس قدر ہلکی پھلکی کہ منہ میں ڈالو تو نگل جائیں۔ بدھ مذہب جتنا خود بےلذت ہے۔ اتنے ہی اس کے کھانے لذیذ ہیں۔ آخر میں یہ کہوں گی کہ میری باتوں میں نہ آیئے گا۔ اس جزیرے کو خود جا کر قائل کیجئے یا قائل ہو جایئے۔ ''ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ''

مشرقی ایشیا میں فرنگی شہنشاہیت کا آخری سنگ میل' تعیشی اجارہ داری کا آخری قلعہ! ہانگ کانگ! بلاشبہ دنیا کے تھرکتے اور تھرتھراتے شہروں میں سے ہے۔ اس کا گالف کورس مشرق میں سب سے نفیس' اس کا ہسپتال ''کوئین الزبتھ'' مشرق میں سب سے بڑا۔ اس کا ریس کورس دنیا میں سب سے زیادہ مہنگا اور بڑا' جہاں کا قدآدم ٹیلیویژن الف سے یے تک ''گھڑ دوڑ'' دکھاتا ہے۔ پھر ہر منزل پر خودکار زینے۔

اس کی آبادی تیس لاکھ ہے۔ (سارے نیوزی لینڈ سے دس لاکھ زیادہ) یہ حقیقت کہ ستر کروڑ چینی صرف چند میل دور سرخ سرحد

KitaabPoint.blogspot.com

کے پار رہتے ہیں' اس شہر کی زندگی میں ایک نیا ولولہ پیدا کرتی ہے ہراس نہیں۔ برطانیہ نے جس پٹے پر اسے چین سے خریدا تھا اس کے بقیہ ۳۵ سال رہ گئے ہیں۔ (یہ مدت اس وقت سے ہے جب مصنف نے یہ تحریر لکھی) اگرچین چاہے تو بغیر انگلی ہلائے اسے ایک ہی سانس میں ہڑپ کرسکتا ہے لیکن اسے کوئی جلدی نہیں۔ جب بغیر کسی دردسری کے کروڑوں پاؤنڈ کا زرمبادلہ چین کو اس کے ذریعے پہنچ رہا ہے تو کیا مضائقہ!

مشرق بعید میں برطانوی سامراج کا آخری علمبردار ہے۔ کب تک اس پرچم کو لہرائے گا۔ اس کا جواب صرف موجودہ کرہ ارض کے دو یاجوج و ماجوج روس اور امریکہ دے سکتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں کم سے کم اگلے دس سال تک ممالک کی قسمتوں کی باگ ڈور ہے۔

◆◆◆